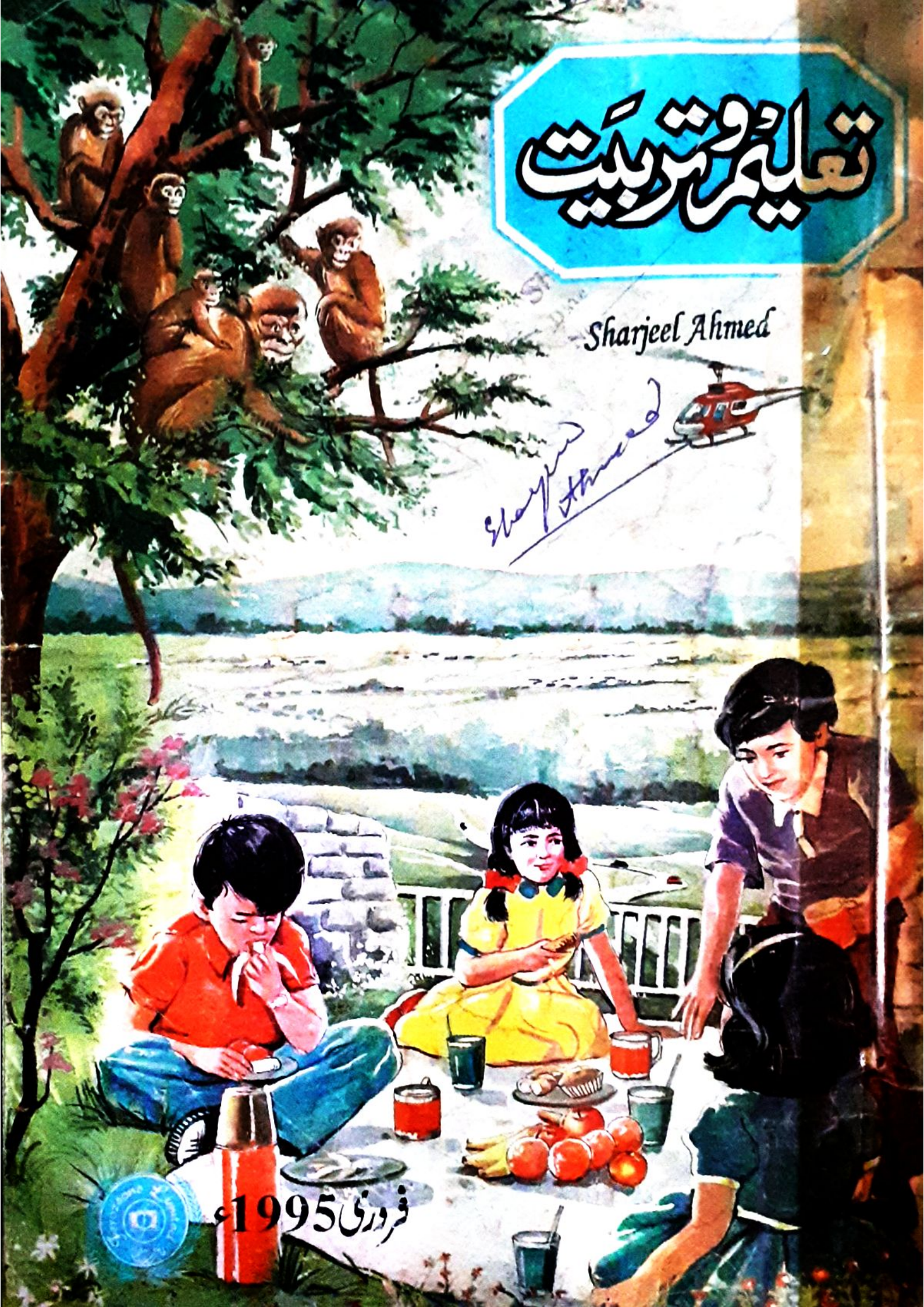

تعلیم و تربیت

Sharjeel Ahmed

فروری 1995ء

Sharjeel Ahmad Warsi
Date
No.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السّلامُ علیکمُ

مہنگائی کا جو حال ہے، وہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ یہ مانا کہ گھر کا سودا سُلف آپ نہیں خریدتے، لیکن آپ امّی کو غصّے سے ہنڈیا برتن پٹختے اور مہنگائی کا رونا روتے تو دیکھتے ہوں گے۔ غضب خدا کا، ہر چیز کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے، اور سِتم پر سِتم یہ کہ اِس میں روز بروز اِضافہ ہو رہا ہے۔

روز مرّہ ضرورت کی چیزوں کے ساتھ کاغذ کی قیمتیں بھی بے تحاشا بڑھی ہیں۔ جس کاغذ پر اخبار اور رسالے چھپتے ہیں، اُس کے دام 60 فی صد تک چڑھ گئے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ پہلے ایک سو روپے کا جتنا کاغذ ملتا تھا، اب اتنا کاغذ 160 روپے کا ملتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں نے کمر توڑ نُقصان سے بچنے کے لیے یا تو صفحات کم کر دیے ہیں یا پھر قیمت بڑھا دی ہے۔

پہلے ہم نے سوچا کہ تعلیم و تربیت کے صفحات کم کر دیں، قیمت نہ بڑھائیں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ یہ بات آپ قبول نہیں کریں گے۔ چُناں چہ مجبوراً قیمت بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اگلے مہینے (مارچ 1995ء) سے تعلیم و تربیت کے ایک پرچے کی قیمت 12 روپے ہوگی۔ ہمیں اُمّید ہے کہ ہمارے ساتھی 2 روپے کے اِس معمولی اِضافے کو خوشی سے قبول کرلیں گے۔

اگلے مہینے سے تعلیم و تربیت میں ایک نیا سلسلہ "باتیں بڑوں کی" شروع کیا جا رہا ہے۔ اِس کے لیے آپ بڑے لوگوں کے اقوال ۔(جنھیں اقوالِ زرّیں یعنی سنہری باتیں کہا جاتا ہے) بھیجیے۔ قول کے ساتھ اُس شخص کا نام ضرور لکھیے جس کا وہ قول یا مقولہ ہے۔ مقولوں کے عِلاوہ کسی شاعِر کا کوئی خوب صورت سا شعر یا کسی کتاب سے کوئی دِل چسپ فِقرہ یا پیراگراف بھی نقل کر کے بھیجا جا سکتا ہے۔ شعر، فِقرے اور پیراگراف کے نیچے شاعِر، ادیب اور اُس کی کتاب کا نام لکھنا نہ بھولیے۔

اس شمارے میں

اداریہ		1
ماہِ صیام (نظم)	افضال عاجز	2
ننھی مُنّی سی ایک ممّنی (کہانی)	سلیم احمد صدیقی	3
شرارتی بھوت (کہانی)	فوزیہ طاہرہ	7
ماں (کہانی)	اشفاق احمد خاں	12
برزخ کے مہمان (کہانی)	محمد یونس حسرت	16
روزہ رکھنے کے فائدے (درسِ قرآن)	ڈاکٹر عبدالرؤف	22
دل چسپ مختصر کہانیاں (انعامی چو)	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	23
بلّی (نظم)	ہمینم حمیدی	25
ایک پتھر (کہانی)	اِحفاظ الرحمان	26
خوف کی دو راتیں (کہانی)	شکیل زاہد	28
بھیڑیے (مضمون)	س۔ل	33
بادام (مضمون)		36
ندی (نظم)	طارق اللہ خاوری	37
بندہ اور بندر (کہانی)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	38
حکایاتِ بوستانِ سعدی		43
داؤدی علمی آزمائش		44
آپ کا خط ملا		46
آئیے مسکرائیں (لطائف)		49
آپ بھی لکھیے		50
آئیے دوست بنائیں		55
گڑیا سوچ میں گم (نظم)	مجید اسماعیل	57
موت کے مُنہ میں (کہانی)	سلیم خاں گمی	58
مجرم کون؟		64

54 واں سال
گیارہواں شمارہ

تعلیم و تربیت

...ستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبُوب رسالہ

...ایڈیٹر: عبدالسلام
...ٹر: سعید لخت
...ٹنٹ ایڈیٹر: رِضوان ثاقب
...شنز ڈیزائننگ: سید شوکت لعجاز
...ش اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
...ر: ظہیر سلام
عبدالسلام

پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت
3۔ شارع بن بادیس لاہور
...ن: 6361309-6361310
6278815-6278816

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
6۔ شاہراہ قائدِاعظم لاہور

سالانہ قیمت
...یں (صرف رجسٹری کے ساتھ) 225/- روپے
...لی / افریقہ (ہوائی ڈاک سے) 435/- روپے
...ہوائی ڈاک سے) 625/- روپے
...رقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) 650/- روپے
...قیمت منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعے پیشگی ارسال کیجیے

فروری 1995

قیمت فی پرچہ 10/- روپے

سرورق: شرارتی بھوت

افضال عاجز

ماہِ صیام آیا

آؤ خوشی منائیں، ماہِ صیام[1] آیا
سوتوں کو اب جگائیں، ماہِ صیام آیا

لگ جائے گا کنارے، اُس شخص کا سفینہ[2]
پایا جہاں میں جس نے، رحمت کا یہ مہینا

رکھے گا جو بھی روزہ، وہ عالی شان ہوگا
جنّت کی وادیوں میں، اُس کا مکان ہوگا

روزے کو رکھ کے جس نے کھانے سے مُنہ کو موڑا
اپنے خدا سے گویا، رِشتہ ہے اُس نے جوڑا

سب رحمتیں اُسی پر، سات آسماں اُسی کے
جس نے بھی روزہ رکھّا، دونوں جہاں اُسی کے

لُطف و کرَم کے اُس نے، کیا کیا مزے نہ چکھّے
ہر حال میں بھی جس نے، روزے تمام رکھّے

(1) روزوں کا مہینا۔ صِیام، صَوم (یعنی روزہ) کی جمع ہے۔
(2) کشتی

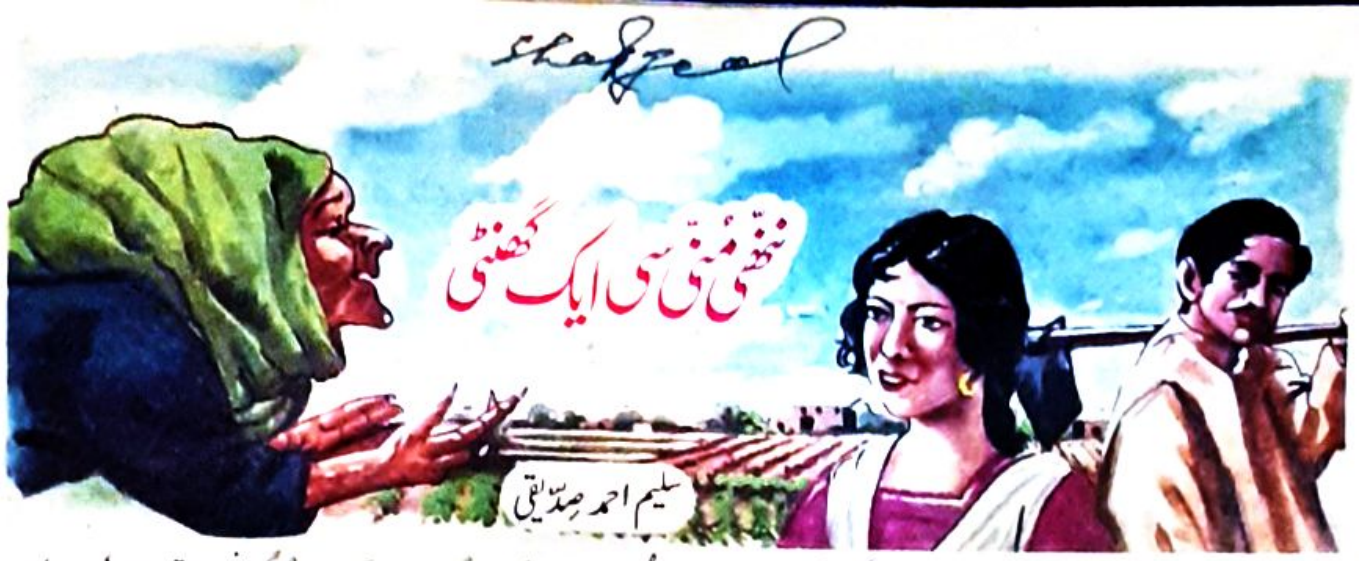

اِس دُنیا میں کچھ ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہیں جن کے دِل میں ایک ننھّی مُنّی سی گھنٹی ہوتی ہے۔ یہ گھنٹی برابر بجتی رہتی ہے اور اِس سے اُن کی زندگی بہت سکون اور آرام سے بسر ہوتی ہے۔ اِسے قناعت یا صبر شکر کی گھنٹی کہتے ہیں۔ جس کے دِل میں یہ گھنٹی ہوتی ہے، وہ غریبی میں بھی امیری کے مزے لیتا ہے۔

آج ہم آپ کو ایسی ہی ایک عورت کی کہانی سُناتے ہیں جس کے دل میں قناعت کی یہ ننھّی مُنّی سی گھنٹی ہر وقت بجتی رہتی تھی۔ جب اُس کا شوہر تھکا ہارا کام کاج سے واپس آتا تو وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اُس کا اِستقبال کرتی، حال آں کہ وہ بھی دن بھر کے کام کاج سے تھکی ماندی ہوتی تھی۔ اُس کا شوہر اُسے مسکراتے دیکھ کر پُوچھ بیٹھتا۔ "بیوی، ہم ایک ٹُوٹے پھُوٹے جھونپڑے میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس بس ایک چھوٹا سا کھیت ہے۔ ہم صبح سے شام تک جانوروں کی طرح کام کرتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں نہ ڈھنگ سے کھانے کو ملتا ہے اور نہ پہننے کو۔ اس پر بھی تم ہر وقت مسکراتی رہتی ہو۔ یہ کیا بات ہے؟"

"مجھے خود پتا نہیں" بیوی مسکرا کر جواب دیتی "بس مجھے ایسا لگتا ہے کہ اللہ نے ہمیں بہت کچھ دے رکھا ہے اور مجھے اِسی لیے سکون محسوس ہوتا ہے"۔

کچھ دنوں بعد اُن کے حالات اور خراب ہوگئے۔ بارشیں وقت پر نہ ہوئیں، فصل خراب ہوگئی اور اُن کی اِکلوتی بکری بھی بیمار پڑ گئی۔ شوہر بے چارہ بہت پریشان رہنے لگا۔ بیوی سے شوہر کی پریشانی دیکھی نہ جاتی تھی۔ ایک دن اُسے یاد آیا کہ جنگل میں ایک جادوگرنی رہتی ہے، جو جادو کے زور سے حیرت انگیز کام کرتی ہے۔ چُناں چہ ایک صبح وہ، مُنہ اندھیرے، گھر سے نِکل کھڑی ہوئی۔ چلتی گئی، چلتی گئی اور آخر جادوگرنی کے غار کے پاس جا پہنچی۔ لیکن جُوں ہی اُس نے غار میں جھانک کر دیکھا تو خوف سے اُس کی چیخ نِکل گئی۔ غار کے اندر یہ بڑے بڑے دانتوں والی خوف ناک شکل کی ایک عورت بیٹھی تھی اور اُس کے گلے میں مالاؤں کی طرح سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ عورت کا جی چاہا کہ وہ بھاگ جائے۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ وہ تو یہاں اپنے شوہر کی مدد کے لیے آئی تھی۔ چُناں چہ اُس نے ہمّت کی اور غار کے اندر داخل ہوگئی۔

اُس نے جادوگرنی سے کہا "جادوگرنی صاحبہ، میرے شوہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ غریب لوگوں کی مدد کرتی ہیں"۔

"تم نے ٹھیک سُنا ہے، قہ قہ قہ" جادوگرنی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میں تمہاری مدد کروں گی، لیکن اِس کے بدلے میں تُمھیں مجھے وہ ننھّی مُنّی گھنٹی دینا ہوگی جو تمہارے دل میں بجتی ہے"۔

"اچھّا؟" عورت نے حیرت سے کہا "کیا میرے دل میں سچ مُچ کوئی گھنٹی ہے؟"

"ہاں" جادوگرنی بولی "تم یہ گھنٹی مجھے دے دو اور میں اِس کے بدلے میں تمہیں بہت سی دولت دے دوں گی"۔

"اگر ایسا ہے، تو آپ یہ گھنٹی لے لیں" عورت نے

کہا۔ وہ اپنے شوہر کی پریشانی ہر قیمت پر دُور کرنا چاہتی تھی۔

جادوگرنی نے اپنا بایاں ہاتھ عورت کے سینے پر رکھ کر جادُو کے کچھ لفظ بولے اور ننھّی سی گھنٹی اُس سے لے لی۔ پھر اُس سے کہا "جاؤ، گھر جاؤ! تمہیں سب کچھ مِل جائے گا!"

جب عورت گھر واپس پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اُس کے ٹُوٹے پھُوٹے جھونپڑے کی جگہ ایک خوب صورت سا، بڑا سا پکّا مکان کھڑا ہے اور چھوٹے سے کھیت کی جگہ بڑے بڑے کئی کھیت ہیں جن میں طرح طرح کی فصلیں لہلہا رہی ہیں۔ مکان کے صحن میں بہُت سی گائیں بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ گھر کے اندر گئی تو شوہر مسکرا کر بولا "اری نیک بخت! ہمارے تو دِن ہی پھر گئے!"

لیکن بیوی اپنے شوہر کی خوشی میں زیادہ دِن شریک نہ رہ سکی۔ اُسے ایسا لگتا تھا جیسے اُس کے اندر سے کوئی چیز نکل گئی ہے۔ جُوں جُوں وقت گزُرتا گیا، وہ اور زیادہ غم گِین اور پریشان رہنے لگی۔ اب اُن کے پاس بہُت سی گائیں بھینسیں اور بھیڑ، بکریاں تھیں، لیکن اگر اُن میں سے ایک جانور بھی بیمار ہو جاتا تو وہ پریشان ہو جاتی۔ اگر کوئی فصل خراب ہو جاتی تو اُس کا دل بیٹھنے لگتا۔

"میری بیوی کو کیا ہوگیا ہے؟" اُس کا شوہر حیران ہو کر سوچتا "وہ تو اب پہچانی بھی نہیں جاتی"۔ بعض وقت شوہر اِس لیے گھر سے زیادہ دیر تک باہر رہتا کہ بیوی کو پریشان اور غم گِین دیکھ کر اُسے دُکھ ہوتا تھا۔ جب وہ دیر سے گھر آتا تو بیوی رو رو کر بُرا حال کرلیتی۔ آخر ایک دن شوہر سے برداشت نہ ہُوا۔ وہ کہنے لگا "جب ہم غریب تھے تو تُم خوش رہتی تھیں، اور اب ہم امیر ہو گئے ہیں تو تُم ہر وقت مُنہ پھلائے رہتی ہو"۔

تب عورت نے پوری کہانی شوہر کو کہ سُنائی۔ اُس نے کہا "جب سے جادوگرنی نے میرے دِل کے اندر سے وہ ننھّی مُنّی سی گھنٹی نکال لی ہے، تب سے میں پریشان رہنے لگی ہوں"۔

شوہر نے کہا "میں تو چاہتا ہوں کہ تُم خوش رہا کرو، لیکن تُم تو ہر وقت ٹسوے بہاتی رہتی ہو۔ ہماری یہ دولت کس کام کی، اگر ہمارے گھر میں سُکون ہی نہ ہو۔ تم ایسا کرو، کل صبح میرے دادا کے پاس چلی جاؤ۔ وہ بہُت عقل مند ہیں۔ وہ اِس کا ضرور کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے"۔

اگلے دن جب بیوی شوہر کے دادا کے ہاں پہنچی تو اُنہوں نے بڑے اِطمینان سے اُس کی کہانی سُنی اور پھر بولے "تم نے ایک بہُت بُرا سودا کیا ہے۔ اُس ننھّی مُنّی گھنٹی ہی سے تمہیں خوشی حاصل ہوتی تھی۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بِگڑا۔ تم جادوگرنی سے سال ختم ہونے سے پہلے پہلے اپنی گھنٹی واپس لے سکتی ہو۔ لیکن اِس کے بدلے میں تمہیں وہ تمام مال مویشی اُسے واپس کرنا ہوں گے جو اُس نے تمہیں دِیے ہیں"۔

"پھر تو کام بن جائے گا۔ ابھی تو دس ماہ ہی ہوئے ہیں۔ سال ختم ہونے میں دو مہینے باقی ہیں"۔ عورت بولی۔

"یہ ایک بُوٹی اپنے پاس رکھ لو" دادا نے کہا "اگر جادوگرنی تمہاری راہ میں کوئی رُکاوٹ کھڑی کرے تو اِس بُوٹی کا ایک پتّا کھا لینا۔ رُکاوٹ دُور ہو جائے گی۔ جادوگرنی کبھی نہ چاہے گی کہ وہ گھنٹی تمہیں واپس کر دے۔ اِس لیے وہ تمہیں طرح طرح سے ڈرائے گی"۔

بیوی خوش خوش گھر واپس آئی اور شوہر کے دادا نے جو کچھ کہا تھا، وہ اُس کو کہ سُنایا۔ شوہر سخت ناراض ہُوا۔ چیخ کر بولا "بھلی مانس! جب ہم یہ مال مویشی جادوگرنی کو واپس دے دیں گے تو پھر سے غریب ہو جائیں گے۔ ہاں، اگر گھنٹی کے بدلے ہمیں ایک آدھ گائے بھینس یا بکری دینا پڑے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ساری چیزیں تو کبھی واپس نہیں دوں گا"۔

اگلی صبح بیوی نے دو بیل لیے اور جادوگرنی کے پاس پہنچی۔ وہ اپنے سانپوں کو دُودھ پلا رہی تھی۔

"اب تم کیا لینے آئی ہو؟" جادوگرنی نے پُوچھا۔

"یہ لو دو بیل، اور میری گھنٹی مجھے واپس کردو" بیوی نے کہا۔

"کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟" جادوگرنی چلّائی "میں گھنٹی صِرف ایک صورت میں واپس دوں گی اور وہ صورت یہ ہے کہ تم میری دی ہوئی تمام چیزیں مجھے واپس دے دو"۔

یہ کہہ کر جادوگرنی نے اُسے جانے کا اِشارہ کیا اور وہ روتی ہوئی گھر واپس آ گئی۔ جب اُس نے اپنے شوہر کو یہ بات بتائی تو وہ غُصّے میں آگیا اور کہنے لگا "ایک ننھّی مُنّی گھنٹی کے بدلے تمام دولت دے دوں؟ میں کیا اِتنا ہی بے وقوف ہُوں؟"

اُس دن شوہر بیوی سے خوب لڑا، خوب لڑا اور پھر دھڑام سے دروازہ بند کر کے باہر چلا گیا۔

اِس سے پہلے وہ کھیتوں میں جاتا تھا تو اُسے اپنے مال مویشی اور فصلیں دیکھ کر بہُت خوشی ہوتی تھی، لیکن اُس دن اُسے بِالکُل خوشی نہیں ہوئی۔ اُس کا دِل بہُت دُکھی تھا۔ اُسے یاد آیا کہ جب اُن کے پاس دولت نہ تھی تو وہ کتنے خوش تھے۔ اُس کی بیوی ہر وقت مسکراتی رہتی تھی اور اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر اُس کی تمام تھکن اور پریشانی دُور ہو جاتی تھی--- "ارے! کیا واقعی ہماری وہ خوشی اُس ننھّی مُنّی گھنٹی کی وجہ سے تھی جو میری بیوی کے دِل میں بجتی رہتی تھی؟ میں یہ سارا مال جادوگرنی کو واپس کر دوں گا اور اُس سے وہ گھنٹی لے لوں گا۔ آدمی قناعت پسند اور صبر شکر والا ہو تو غریبی میں بھی مزہ آتا ہے"۔

یہ سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچا۔ اُس وقت سُورج ڈُوب رہا تھا۔ اُس کی بیوی دروازے کی دہلیز پر سر رکھے روتی روتی سو گئی تھی۔

"بیوی! بیوی! اُٹھو!" شوہر نے بڑے پیار سے اُسے جگایا "ہم آج جادوگرنی کے پاس جائیں گے اور اُس کی دولت اُسے واپس دے کر تمہاری ننھّی مُنّی گھنٹی لے آئیں گے"۔ بیوی نے شوہر کی طرف تعجّب سے دیکھا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔

دوسرے دِن صبح کو وہ دونوں جادوگرنی کے غار کی طرف چل دِیے۔ راستے میں بیوی نے شوہر کو بتایا کہ آج سال کا آخری دِن ہے۔ شام سے پہلے پہلے ہمیں جادوگرنی سے گھنٹی واپس لے لینی چاہیے۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ اچانک ایک بدصورت بَلا اُن کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ یہ بلا جادوگرنی کی بھیجی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ آج کا دن کسی طرح گزر جائے۔ پھر اُسے گھنٹی واپس نہ دینی پڑے گی۔

بلا زور سے چنگھاڑی اور بولی "تم صِرف ایک شرط پر آگے جا سکتے ہو!"۔

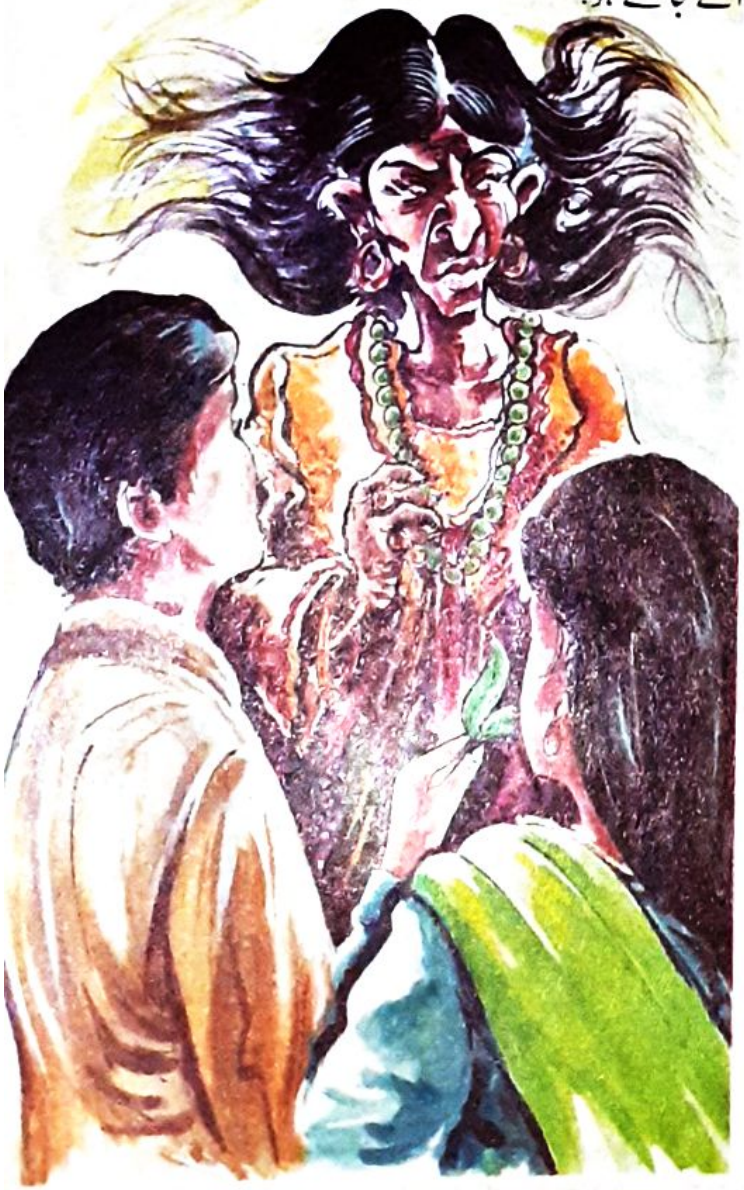

"کون سی شرط؟" شوہر نے پُوچھا۔

"اِس سُوئی کے ناکے میں یہ رسّی ڈال دو"۔ بلا نے ایک ہاتھ میں ایک سُوئی اور دوسرے ہاتھ میں ایک موٹی سی رسّی پکڑ رکھی تھی۔

بیوی کو دادا کی دی ہوئی بُوٹی یاد آگئی۔ اُس نے جیب میں سے بُوٹی نکالی اور اُس کا ایک پتّا چبا کر کھالیا۔ اُس کے بعد اُس نے رسّی اور سُوئی بلا سے لی تو رسّی ایک دم دھاگا بن گئی اور اُس نے آسانی سے اُسے سُوئی کے ناکے میں ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر بلا زور سے دہاڑی اور غائب ہوگئی۔

اب میاں بیوی خوشی خوشی آگے بڑھے۔ لیکن کچھ دُور جاکر اُن کے راستے میں ایک بہت بڑا دریا آگیا۔

"یہ دریا پہلے تو یہاں نہیں تھا!" بیوی نے کہا۔

"یہ دریا بھی جادو کا ہوگا' جیسے وہ بلا جادو کی تھی" شوہر نے جواب دیا۔

"تب تو دادا کی بُوٹی یہاں بھی کام آئے گی"۔ یہ کہہ کر

بیوی نے کُرتے کی جیب میں سے بُوٹی نکالی اور اُس کا ایک پتّا چبا کر کھالیا۔ دریا کی چوڑائی کم ہوگئی۔ اُس نے ایک اور پتّا کھایا تو دریا کا پانی کم ہوگیا۔ اب بُوٹی کا ایک ہی پتّا بچا تھا۔ بیوی نے اللہ کا نام لے کر وہ پتّا بھی کھالیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دریا چھوٹا سا نالا بن گیا' جسے میاں بیوی نے آسانی سے پار کرلیا۔

اب وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے کیوں کہ شام ہونے والی تھی۔ سُورج غرُوب ہونے سے ذرا پہلے وہ جادوگرنی کے غار میں پہنچ گئے۔

بیوی نے جادوگرنی سے کہا "تم وہ تمام مال واپس لے لو جو تُم نے مجھے دیا تھا' اور میری ننھی مُنّی گھنٹی مجھے واپس کردو"۔

جادوگرنی نے ایک نظر شوہر کی طرف ڈالی اور بولی "تُم کیا کہتے ہو؟ کیا تمہیں مال مویشی' مکان' کھیت اور فصلیں نہیں چاہئیں؟"

شوہر جلدی سے آگے بڑھا اور بولا "نہیں' مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ تم تمام مال مویشی' مکان اور کھیت واپس لے لو اور میری بیوی کے دل کی ننھّی مُنّی گھنٹی واپس کردو"۔

"تم آج نہ آتے تو یہ گھنٹی ہمیشہ کے لیے میری ہو جاتی" جادوگرنی نے کہا پھر اپنا دایاں ہاتھ عورت کے سینے پر رکھ کر جادو کے کچھ لفظ بولے۔ اِس طرح ننھّی مُنّی گھنٹی بیوی کو واپس مِل گئی۔

دونوں میاں بیوی مسکراتے ہوئے' ہاتھ میں ہاتھ ڈالے' گھر کو لوٹے تو وہاں نہ پُختہ مکان تھا نہ بڑے بڑے کھیت' اور نہ گائیں بھینسیں۔ وہاں اُن کا وُہی ٹُوٹا پھُوٹا جھونپڑا کھڑا تھا اور اُس کے ننھّے سے آنگن میں اُن کی بکری بندھی تھی۔ ساتھ ہی اُن کا چھوٹا سا کھیت تھا جس میں فصل لہلہا رہی تھی۔ وہ پھر سے غریب ہوگئے تھے۔ لیکن دونوں خوش تھے کیوں کہ بیوی کے دِل میں صبر شُکر کی وہ ننھّی مُنّی گھنٹی پھر سے بجنے لگی تھی جو آدمی کو خوش رکھتی ہے۔

شرارتی بھوت

فوزیہ طاہرہ

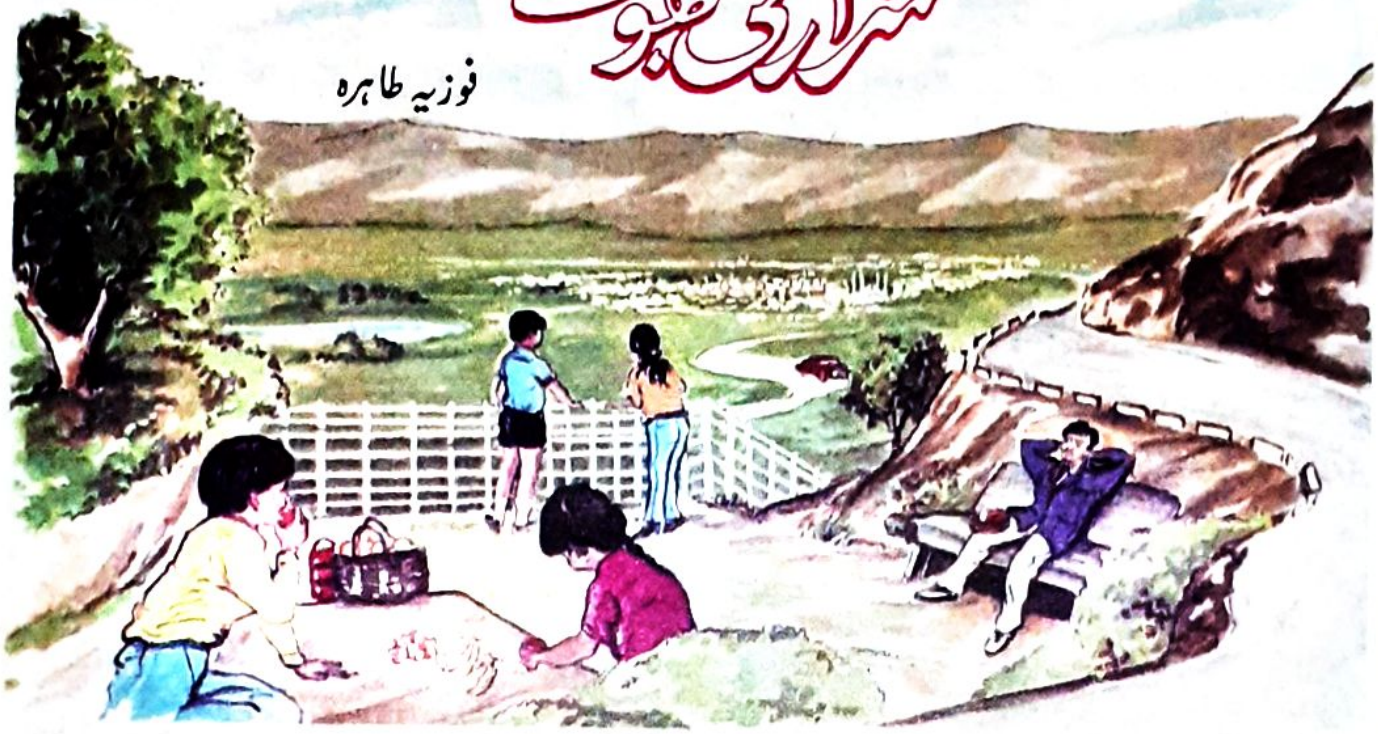

آج میں واقعی بہت خوش تھا کیوں کہ آج میری پہاڑ پر چڑھنے کی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ گاڑی میں سامان لادا جا چکا تھا اور ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم مارگلہ کی پہاڑیوں کی بجائے "کے ٹو" کی چوٹی سر کرنے جا رہے ہیں۔ آنٹی لبنیٰ کے گھر سے مارگلہ کی پہاڑیوں کا فاصلہ ایک فرلانگ سے زیادہ نہ تھا' لیکن سامان زیادہ ہونے کے باعث یہ طے پایا کہ گاڑی میں جانا بہتر ہو گا۔

آنٹی لبنیٰ اور انکل اختر امّی جان کے دُور کے ننھیالی رشتے دار تھے' لیکن اُن کے خلوص اور محبت کی وجہ سے وہ ہمیں قریبی رشتے دار لگتے تھے۔ ہم جب بھی اسلام آباد جاتے تو اُن ہی کے ہاں ٹھہرتے۔ اِس مرتبہ پُورے تین سال بعد اسلام آباد آنا ہُوا تھا' اور آتے ہی میں نے رٹ لگا دی تھی کہ ہم مارگلہ کی پہاڑیوں کی سیر کریں گے۔ آنٹی لبنیٰ کو کیا اِعتراض ہو سکتا تھا۔ لہٰذا آن کی آن میں پروگرام بن گیا۔ ہم نے رشید ڈرائیور کو ساتھ لیا اور ہم سب مارگلہ کی پہاڑیوں کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک فرلانگ کا راستہ پلک جھپکنے میں طے ہو گیا۔ رشید نے ایک لمبے چوڑے میدان میں گاڑی پارک کی۔ وہاں پہلے ہی بے شمار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مگر گاڑی والے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شاید اِدھر اُدھر سیر سپاٹا کر رہے ہوں گے۔ رشید نے کار کی ڈِکی کھولی اور کچھ سامان خود اُٹھا لیا۔ آنٹی کی چھوٹی بیٹی پلوشہ نے پاپ کارن کے لفافے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ اُس کی منجھلی بہن "پرخا" نے امرودوں کا تھیلا اُٹھا لیا کیوں کہ امرود اُس کا پسندیدہ پھل تھا' اور بڑے بھائی ساگر نے کِنو اور سیبوں کی ٹوکری پکڑ لی۔ آنٹی لبنیٰ نے پلوشہ اور پرخا کو سمجھایا تھا کہ پہاڑی پر چڑھنا بہت مشکل کام ہے۔ اِس لیے سامان لے کر اُوپر مت چڑھنا۔ لیکن یہ لوگ کہاں ماننے والے تھے۔ آخر انکل اختر اور آنٹی کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور کھانے پینے کا سامان بھی ساتھ لے جانا پڑا۔

چُوں کہ ہم سب نے جوگرز پہن رکھے تھے اِس لیے ہمیں تھوڑا تھوڑا سامان اُٹھانے میں کوئی دِقّت پیش نہ آئی۔

میری امّی جان اور آنٹی لُبنیٰ آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہی تھیں، جب کہ ہم سب بچّے چوکڑیاں بھرتے چڑھتے چلے جارہے تھے۔ اور بھی بہُت سے لوگ جن میں مرد، عورتیں اور بچّے شامل تھے، اپنی اپنی دُھن میں مگن اُوپر دوڑے جارہے تھے۔ پہاڑی پر چڑھنے کے لِیے باقاعدہ ٹریک یعنی پگ ڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں کہ چڑھنے میں دِقّت نہ ہو۔

پندرہ مِنٹ کی مُسلسل چڑھائی کے بعد امّی جان اور آنٹی لبنیٰ کا سانس پھُولنے لگا۔ لہٰذا اُنھوں نے آگے بڑھنے سے اِنکار کردیا اور وہیں ایک طرف بنے ہوئے لکڑی کے چبوترے کے نیچے بنچ پر بیٹھ گئیں۔ اِس سے پہلے کہ ہمیں بھی وہیں روک لیا جاتا، آنٹی لبنیٰ ہمارا مُوڈ بھانپ گئیں اور اُنھوں نے رشید کو ہدایات دے کر اُسے ہمارے ساتھ جانے کے لِیے کہا۔ اُنھوں نے ہم سے اپنے اور امّی جان کے کھانے کے لِیے کچھ کِنو اور سیب لے لِیے اور جلد واپس آنے کی تاکید کی۔

کچھ دیر بعد ہم اِتنی بلندی پر پہنچ چکے تھے کہ وہاں سے سارا اِسلام آباد صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جِس طرف نِگاہ دوڑاتے، سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا۔ اُونچے اُونچے پہاڑ گھنے جنگلوں میں گھِرے ہوئے تھے۔ ننھّی پلوشہ تو اپنے پاپ کارن کھا کھا کر ختم کرچکی تھی اور شاید تھک بھی گئی تھی۔ اِس لِیے رشید نے اُسے گود میں اُٹھا لیا تھا۔ البتّہ پرخا ساگر کی اُنگلی چھُڑا کر کافی آگے نکل گئی تھی۔

رشید نے ہمیں بتایا کہ اِس وقت ہم تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کی بلندی پر ہیں۔ میں نے رُک کر ایک نظر نیچے سڑک کی جانب ڈالی تو دِل دھک سے رہ گیا۔ سڑک پر چلتی ہوئی گاڑیاں کِھلونوں کی مانند دکھائی دے رہی تھیں۔

اب سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ اِس سے پہلے کہ ہم اور اُوپر جاتے پلوشہ اور پرخا نے کِنو اور سیب کھانے کی رٹ لگادی۔ چُناں چہ ہم نے طے کیا کہ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد پھر اُوپر چڑھیں گے۔ لہٰذا ٹریک کے بائیں جانب چادر بچھائی گئی اور سارا پھل اُس پر اُلٹ دیا گیا۔ مارے بھوک کے سب کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اِس لِیے سب پھلوں پر ٹُوٹ پڑے۔ پرخا نے تو ندیدوں کی طرح دونوں ہاتھوں میں امرود بھر لِیے۔ میں اور ساگر سیب کھانے لگے۔

اِسی اَثنا میں پلوشہ نے آسمان کی طرف دیکھ کر شور مچانا شروع کردیا "آہا! آہا! جہاز ..... وہ دیکھو، ساگر بھیّا، ہنی بھیّا، وہ دیکھو!"

پلوشہ کا شور سُن کر ہم سب نے بھی اُس ہیلی کاپٹر کی جانب دیکھا جو مشرِق کی طرف سے آرہا تھا۔ اِتنے قریب سے ہیلی کاپٹر کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔۔۔ ہم سب اُس کو دیکھنے میں محو ہوگئے۔

"ہنی بھیّا' اِس ہیلی کاپٹر میں کون بیٹھا ہے؟" پرخا نے ہیلی کاپٹر پر نظریں گاڑے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ اِس سے پہلے کہ میں جواب دیتا' رشید بول اُٹھا:

"بڑے صاحِب کہتے ہیں' ہیلی کاپٹر میں بڑے بڑے وزیر بیٹھتے ہیں"۔

"وہی بادشاہ سلامت والے وزیر جو دادا ابّو ہمیں کہانیوں میں سُنایا کرتے ہیں؟" پلوشہ نے پُوچھا۔

"ارے بھئی' نہیں۔ اِس زمانے کے وزیر اور طرح کے ہوتے ہیں" میں نے پلوشہ کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

ہیلی کاپٹر نے جانے کیوں تین چار چکّر دائرے کی صورت میں لگائے اور پھر آہستہ آہستہ نظروں سے دُور ہونے لگا۔ یہ سارا منظر ہمیں بہت اچھّا لگا۔ ہم خوشی خوشی واپس اُس جگہ پر آئے جہاں ہم نے کھانے پینے کا سامان رکھا تھا۔ لیکن اِس سے پہلے کہ ہم پھلوں پر ہاتھ صاف کرتے' ہماری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی۔ امرود اور سیب سب غائب تھے۔ بس بید کی خالی ٹوکری پڑی ہوئی تھی۔ ہمارے لیے یہ بات ایک مُعمّے سے کم نہ تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ سارا پھل کِدھر گیا' جب کہ ہمارے سِوا وہاں کوئی اور شخص تھا ہی نہیں؟

"ہنی بھیّا' یہاں ضرور کوئی بھُوت ہے" پرخا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے" یہ کہہ کر پلوشہ نے رونا شروع کردیا۔

"پرخا ٹھیک کہتی ہے۔ جنگلوں میں چُڑیلیں بھی تو رہتی ہیں ناں"۔ رشید نے کہا۔ وہ ہمیں خوف زدہ کررہا تھا۔

ساگر نے بھی اِسی قسم کا خیال ظاہر کیا۔ اب تو میری رہی سہی جان بھی ہوا ہونے لگی۔ بات بھی تو حیرت کی تھی۔ پانچ دس مِنٹ کے اندر اندر سارے پھل کون چٹ کر گیا؟

"جلدی جلدی سامان اُٹھاؤ اور نیچے بھاگو۔ مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے"۔ رشید نے زمین پر بچھی چادر ٹوکری میں ٹھونستے ہُوئے کہا۔

"ہائے! میرا موتیوں والا ہار!" پرخا کو ایک دم اپنا سفید موتیوں والا ہار یاد آگیا جو ابّو نے اُسے چین سے لاکر دیا تھا اور جسے اُس نے اُتار کر چادر پر رکھ دیا تھا۔

"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ جلدی سے نیچے چلو" میں نے کہا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اِن گھنے جنگلوں میں بھُوت بھی ہوسکتے ہیں۔

سیر کا سارا مزہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ سب جلدی جلدی نیچے کی جانب بھاگنے لگے۔ پرخا سب سے آگے تھی۔ وہ ایک دم رُک گئی اور چِلّا کر بولی "ساگر بھیّا' وہ دیکھو' مونکی۔ کچھ کھارہا ہے"۔

"اور وہ دیکھو' بندریا کا بچّہ" ساگر نے بتایا۔

"دو اور مونکی' ہنی بھیّا" پلوشہ نے چِلّاتے ہوئے کہا۔

ہم سب ایک لمحے کے لیے رُک گئے اور بندروں کو دیکھنے لگے جو مزے لے لے کر سیب اور امرود کھارہے تھے۔

"ہنی بھیّا' یہاں سیب کے درخت ہیں کیا؟"

پرخا نے ایک بندر کو سیب کھاتے دیکھ کر مجھ سے پُوچھا۔ ابھی میں اُس کے سوال کا جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ اُس نے چِلّانا شروع کردیا" میرا ہار! وہ دیکھو' میرا ہار' بندر کے گلے میں"۔

ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک بندر نے گلے میں سفید موتیوں کا ہار پہن رکھا تھا۔ اب سارا مُعاملہ ہماری سمجھ میں آگیا۔ ہمارے سیب اور کِنو غائب کرنے والے یہی شرارتی بھوت تھے اور پرخا کا ہار بھی وہی لے اُڑے تھے۔ اب تو پرخا نے ضِد شروع کردی کہ بندر سے کہیں کہ میرا ہار واپس کردے۔ بڑی مشکل سے بہلا پھُسلا کر ہم اُسے نیچے لے کر آئے جہاں میری امّی جان اور لُبنیٰ آنٹی ہمارا اِنتظار کررہی تھیں۔ ہم نے اُنہیں سارا قِصّہ سُنایا تو اُن کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔

اب مغرب کا وقت ہونے کو تھا۔ لہٰذا جلدی جلدی نیچے اُترے، کار کی ڈِکی میں ٹوکری رکھی اور آن کی آن میں گھر جا پہنچے۔ پرخا اور پلوشہ نے گھر میں داخل ہوتے ہی انکل اختر کو سارا قصّہ الف سے ے تک سُنا ڈالا۔ وہ بھی خوب ہنسے۔ اِتنے میں رشید نے آکر بتایا کہ ٹوکری میں بندر کا ایک بچّہ چھُپ کر بیٹھ گیا تھا اور وہ ہمارے ساتھ آگیا ہے۔ پرخا تو یہ سُن کر بہُت خوش ہوئی۔ بولی "میں اُسے نہیں چھوڑوں گی۔ اُس نے اور اُس کے بہن بھائیوں نے ہمارے امرود چُرائے تھے اور میرا اِتنا پیارا ہار بھی لے گئے تھے"۔ لیکن انکل اختر نے اُسے سمجھایا کہ جانوروں کو تنگ کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ ہم اُسے چھوڑ دیں گے۔ وہ اپنے ماں باپ کے پاس چلا جائے گا۔ اُنہوں نے پرخا کو بہُت سے کھِلونے دینے کا وعدہ کیا جس پر وہ راضی ہوگئی۔ بندر کے ننھّے مُنّے بچّے کو لاؤنج میں زنجیر سے باندھ دیا گیا۔

"ننھے بھُوت، آیندہ کسی کے پھل مت چُرانا۔ بہُت بُری بات ہے" ننھّی پلوشہ نے چاکلیٹ کا کچھ حِصّہ توڑا اور بندر کے بچّے کے آگے پھینکتے ہوئے اُسے نصیحت کرنے لگی۔ میں رات بھر منصوبے بناتا رہا کہ صبح کو امّی جان سے کہوں گا کہ انکل اختر بندر کا یہ بچّہ ہمیں دے دیں۔ ہم اِسے لاہور لے جائیں گے۔

"اللہ کرے انکل اختر مان جائیں" میں دِل ہی دِل میں دُعا مانگتا رہا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

مجھے صبح ہونے کا پتا بھی نہ چلتا اگر ساگر ہانپتا ہُوا مجھے جگانے کے لِیے نہ آجاتا۔ وہ مجھے جھنجوڑ کر بولا "ہنی بھیّا، اُٹھو۔ باہر صحن میں چل کر تو دیکھو"۔

ساگر کی یہ بات سُن کر میں چپّل گھسیٹتا ہُوا صحن کی طرف دوڑا۔

"ارے! اِتنے سارے بندر! اُف خُدایا!" بے اِختیار میری چیخ نِکل گئی۔ مین گیٹ کی دیوار پر 5، 6 بندر بیٹھے تھے اور اُن میں ایک بندر وہ بھی تھا جس نے اپنے گلے میں پرخا کا موتیوں والا ہار پہن رکھا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ بندروں کی یہ فوج اپنے بچّے کی تلاش میں یہاں آئی ہے۔ پرخا، پلوشہ، ساگر اور میں، سب دم سادھے، بندر کے بچّے سے ذرا پرے، دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے اور بندروں کو دیکھ رہے تھے۔

"ہنی بھیّا، پلیز! مجھے میرا ہار لادو نا۔ وہ دیکھو۔ اُس بندر نے پہن رکھا ہے" پرخا نے مُنہ بسُورتے ہُوئے مجھ سے کہا۔

"واقعی ساگر، ہمیں کچھ کرنا چاہیئے۔ کسی نہ کسی طرح یہ ہار واپس لینا چاہیئے۔۔۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔۔۔؟" میں اور ساگر سنجیدگی سے سوچنے لگے۔

"ہنی بھیّا' میں ایک ترکیب بتاؤں؟" پلوشہ نے چُونگ گم چباتے ہوئے کہا۔

"جلدی بتاؤ۔ لیکن ذرا آہستہ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری آواز سُن کر بندر بھاگ جائیں" ساگر نے ننھّی پلوشہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایسا کریں کہ میرا موتیوں والا ہار اُس بندر کو دکھائیں۔ جب وہ لینے کے لِیے نیچے آئے تو جھٹ سے اُس کے گلے سے پرخا کا ہار اُتار لیں"۔

"یہ بھی کوئی ترکیب ہے؟ فضُول۔ بندر نے جھپٹ کر ہمارے ہاتھ سے دوسرا ہار بھی چھین لیا تو پھر؟"

میری یہ بات سُن کر پلوشہ نے بُرا سا مُنہ بنایا۔ لیکن اُس کی ترکیب سُن کر ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا۔ بندر نقّال ہوتے ہیں۔ اُن کی اِس عادت سے فائدہ اُٹھا کر اِس بندر سے ہار لیا جاسکتا ہے۔ میں نے پلوشہ کو ہار لانے کے لِیے کہا۔ وہ دوڑتی ہوئی گئی اور جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنا سفید موتیوں والا ہار لے آئی۔

"اچھّا' اب میرا کرتب دیکھو"۔ یہ کہہ کر میں نے پلوشہ سے ہار لیا اور بندر کے بچّے کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ اگرچہ میں ڈر رہا تھا لیکن پھر بھی میں نے بندر کے بچّے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر پلوشہ کا موتیوں کا ہار اُس کے گلے میں ڈال دیا۔ بندر کا بچّہ ہار سے کھیلنے لگا۔ میں واپس آکر بائیں جانب ستُون کے پیچھے چھُپ گیا۔

اگلے ہی لمحے دیوار پر بیٹھا وہ بندر جس کے گلے میں ہار تھا' نیچے اُترا' بچّے کو پُچکارا اور پھر اپنے گلے سے ہار اُتار کر اُس کے گلے میں پہنا دیا۔ اِس کے بعد واپس دیوار پر جابیٹھا۔ بندر کا بچّہ گلے میں دو ہار دیکھ کر خوشی سے کِلکاریاں مارنے لگا۔ میری ترکیب کام یاب رہی۔

میں جلدی سے ستُون کے پیچھے سے نِکل کر بندر کے بچّے کے پاس جابیٹھا۔ میری یہ کارروائی ساگر' پلوشہ اور پرخا بڑی دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پرخا اور پلوشہ بھلا چُپ کہاں رہ سکتی تھیں۔ وہ آہا آہا کرتی باہر آگئیں۔ اُنھوں نے میرے ہاتھ میں اپنے ہار دیکھ لِیے تھے۔ اُن کے شور سے باقی گھر والے بھی صحن میں آگئے۔ آنٹی لُبنیٰ ہار کی واپسی کا قِصّہ سُن کر حیران بھی ہُوئیں اور خوش بھی۔ امّی جان اور انکل اختر نے میری ذہانت کی خوب داد دی۔ بندروں کی پلٹن چیخ چیخ کر اپنے بچّے کی واپسی کا مُطالبہ کررہی تھی۔ لہٰذا انکل اختر نے بندر کے بچّے کو آزاد کردیا۔ بندروں نے ہماری جانب اِس طرح دیکھا جیسے شکریہ ادا کررہے ہوں۔ پھر وہ اُچھلتے کُودتے جنگل کی طرف بھاگ گئے۔

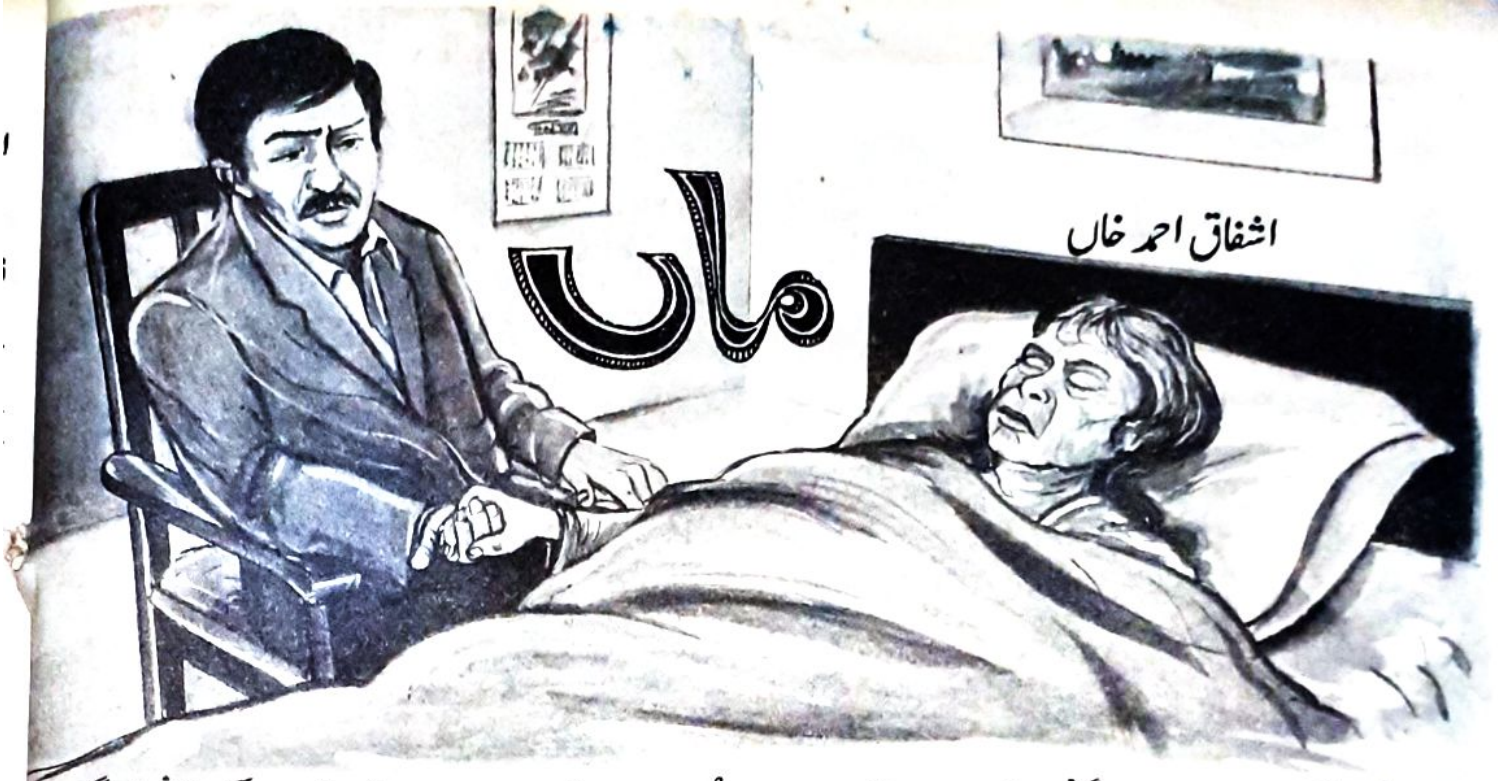

ماں

اشفاق احمد خاں

آج کا دن بڑا مصروف گزرا تھا۔ اِتنے لوگوں سے کاروباری مُلاقاتیں کی تھیں کہ دماغ تھک گیا تھا۔ صبح سے لے کر اب تک چائے کے چار کپ پی چکا تھا اور اب اور چائے منگوانے کے لیے اِنٹرکام اُٹھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے اِنٹر کام رکھ کر فون اُٹھایا۔ دوسری طرف گھر کا ملازِم شرافت تھا۔ اُس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ اُس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا کہ ماں جی کی طبیعت سخت خراب ہے۔ میں نے یہ سُنتے ہی ریسیور رکھا اور باہر نکل گیا۔ اب میری گاڑی گھر کی طرف جا رہی تھی۔

ماں جی ہی میری کُل کائنات تھیں۔ میں اُن کا اِکلوتا بیٹا تھا۔ ابّو کی وفات کے بعد اُنہوں نے ہر طرح کی مُصیبت جھیل کر مجھے اِس مقام پر پہنچایا تھا۔ میرے ذرا سے دُکھ پر اُن کی آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے تھے۔ میرے لیے بھی اُن کی ذرا سی تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔ گزشتہ کچھ دنوں سے اُنہیں سانس کی تکلیف تھی۔ میں نے اُنہیں شہر کے سب سے مہنگے ڈاکٹر کو دِکھایا تھا اور وہ اُس کی دوا باقاعدگی سے کھا رہی تھیں۔ لیکن تھوڑے سے آرام کے بعد اُنہیں پھر تکلیف ہو جاتی تھی۔ آج بھی اُن کی تکلیف بڑھ گئی تھی ورنہ شرافت مجھے فون نہ کرتا۔

شرافت مجھے ماں جی کے کمرے کے باہر ٹہلتا ہُوا ملا۔ اُس نے بتایا کہ اب ماں جی کی طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے اور شاید وہ سو گئی ہیں۔ میں نے دِل میں اِطمینان کی ایک لہر سی محسوس کی۔ گویا اب فِکر کی کوئی بات نہ تھی۔ میں دبے قدموں کمرے میں داخل ہوگیا۔ ماں جی کمبل اوڑھے لیٹی تھیں۔ اُن کی بند آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ سکون سے ہیں۔ میں قریب پڑی کُرسی پر بیٹھ گیا اور دِھیرے سے اُن کے ہاتھ کے اُوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اُنہوں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے کُرسی سے ٹیک لگالی اور اُن کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

ماں جی کے چہرے پر ایک نُور تھا۔ شاید ہر بیٹے کو اپنی ماں کا چہرہ ایسا ہی لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے اِحساس ہُوا کہ وہ گہری نیند میں ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر سے اُٹھانا چاہا تو محسُوس ہُوا کہ اُنہوں نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ اب اگر میں ہاتھ چھُڑانے کی کوشش کرتا تو اُن کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ میں نے اُن کی نیند میں خلل ڈالنا مُناسب نہ سمجھا اور کرسی سے ٹیک لگالی۔

مُسلسل چُپ چاپ اور بے حرکت بیٹھنا کتنا مُشکل کام ہے، یہ وہی جانتے ہیں جو اِس تجربے سے گزرے ہوں۔ مجھے اِس طرح بیٹھے تقریباً چار گھنٹے گزر گئے اور اب مجھے

اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

آج کی رات میرے لیے بہت اہم تھی۔ رات کی فلائٹ سے مجھے گلگت پہنچنا تھا' کیوں کہ صبح وہاں ایک پارٹی کے ساتھ بہت اہم ملاقات کرنا تھی جو میرے کاروبار کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن اب جس طرح وقت گزرتا جا رہا تھا' اس سے مجھے اندیشہ ہو رہا تھا کہ میں وقت پر ہوائی اڈے نہیں پہنچ سکوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ جہاز کا وقت نکل گیا۔ میں چاہتا تو ہاتھ چھڑا کر جا سکتا تھا لیکن--- لیکن کیسے جا سکتا تھا؟ میں آزاد نہ تھا۔ ماں جی کے پیار کی زنجیروں نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔

جہاز کا وقت نکل گیا تو میری پریشانی ختم ہوگئی۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ اب ماں جی جب بھی جاگیں گی میں انہیں بتا کر جیپ کے ذریعے چلا جاؤں گا۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا کہ ماں جی کے جسم میں حرکت ہوئی۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ جواب میں میں نے بھی مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی نظر گھڑی پر پڑی تو چونک گئیں۔

"ارے! میں چار گھنٹے تک سوتی رہی' اور تم اسی طرح بیٹھے رہے؟" اتنا کہہ کر انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور مجھے ڈھیروں دعائیں دیں۔ میں نے انہیں اپنے گلگت کے سفر کے متعلق بتایا تو انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

میں نے کچھ کاغذات بریف کیس میں رکھے اور جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ رات کا سفر تھا اور راستہ بہت خطرناک تھا۔ اس لیے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں عام طور پر گاڑی تیز چلاتا ہوں لیکن خطرناک پہاڑی راستے کی وجہ سے مجھے رفتار آہستہ رکھنا پڑی۔ دن کے وقت اس علاقے کے منظر دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں' لیکن رات کے وقت یہ راستہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ تنگ سڑک پر دو طرفہ ٹریفک کسی بھی لمحے حادثے کا باعث ہو سکتی تھی۔ میں اگر احتیاط نہ کرتا تو اب تک حادثے کا شکار ہو چکا ہوتا۔

مجھ سے آگے ایک ٹرک جا رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت

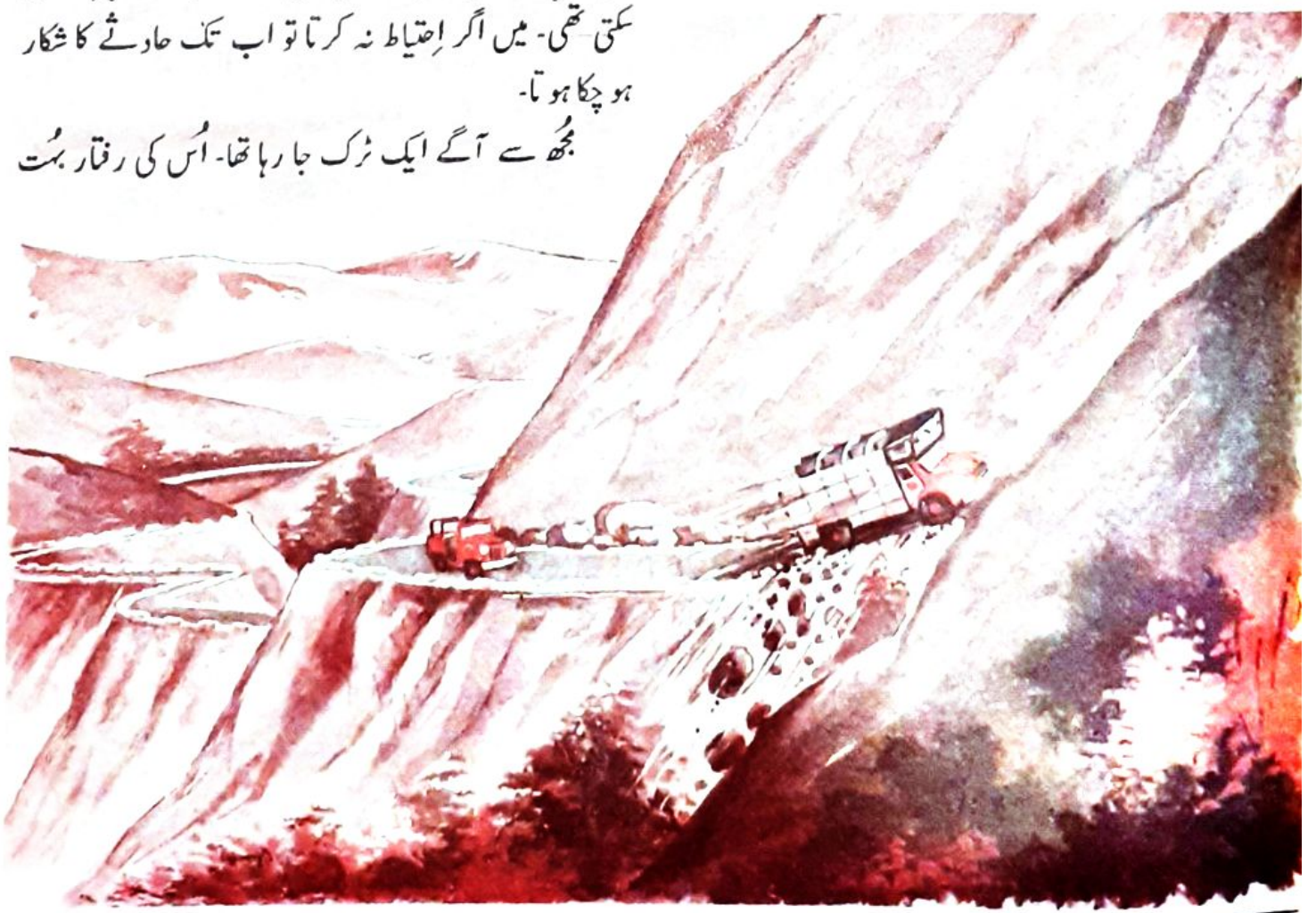

سُت تھی۔ میں اُس سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سڑک اِتنی چھوٹی تھی کہ کہیں سے بھی نکلنے کا موقع نہیں مِل رہا تھا۔ اچانک آگے چڑھائی آگئی۔ سڑک بل کھاتی ہوئی بلندی پر جا رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر ٹرک کی رفتار پہلے سے بھی کم ہوگئی۔ اب جب تک بلندی ختم نہ ہوتی، میں آگے نکلنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ چُناں چہ صبر کر کے، ٹرک سے مُناسِب فاصلے پر، آہستہ آہستہ جیپ چلا رہا تھا کہ یکایک کسی گڑبڑ کا اِحساس ہُوا۔ میں نے جیپ کی رفتار بہُت آہستہ کرلی۔ میری جیپ تو ٹھیک ٹھاک اُوپر جا رہی تھی لیکن ٹرک؟ اوہ خُدایا! ٹرک اُوپر چڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف آ رہا تھا، اور ایسا اِسی صورت میں ہوتا ہے جب گاڑی کے بریک فیل ہو جائیں۔ یقیناً ٹرک کے بریک فیل ہو گئے تھے اور اب وہ بڑی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے فوراً جیپ کو دائیں طرف گھُمایا۔ لیکن وہاں جگہ کم تھی۔ جیپ پہاڑی سے رگڑ کھا گئی۔ اب ٹرک بالکُل سر پر آ گیا تھا۔ میں نے بوکھلا کر جیپ کو بائیں طرف کیا۔ لیکن اِس طرف گہری کھائی اور درخت تھے۔ اِس سے پہلے کہ میں گاڑی کو پیچھے کرتا، ٹرک کا پچھلا حصّہ زور دار آواز سے جیپ سے ٹکرایا اور جیپ تِنکے کی طرح اُڑتی ہوئی نیچے کھائی میں گرنے لگی۔

میں سمجھ گیا کہ اب آخری وقت آ پہنچا۔ میں نے کلمہ پڑھا، اور پھر ماں جی کو یاد کیا۔ شاید یہ ماں جی کی دُعاؤں کا کرشمہ تھا کہ اچانک ایک جھٹکا لگا اور مجھے یوں لگا جیسے کسی نے جیپ کو بڑے پیار سے گود میں بٹھا لیا ہو۔ میں چند لمحے

آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ جیپ آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک درخت کی شاخوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں نے خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اب مجھے زیادہ فِکر نہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دِن چڑھتے ہی لوگ مجھے یہاں سے نکال لیں گے۔

میں نے اپنی کمر سیٹ کے ساتھ لگالی اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ لیکن یہ سُکون زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ اچانک ہلکا سا دھچکا لگا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ جیپ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے سِرک رہی تھی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا تاکہ باہر نکل کر اُوپر کی شاخوں پر چڑھ جاؤں۔ لیکن یہ دیکھ کر میری مایُوسی کی اِنتہا نہ رہی کہ اُوپر کی طرف درخت کی شاخیں نہیں تھیں۔ اب مجھے مجبوراً نیچے کی طرف اُترنا تھا۔ میں دوسری طرف سے باہر نِکلا اور درخت کی موٹی موٹی شاخیں پکڑ کر نیچے کھائی میں اُترنے لگا۔

اب جیپ بھی آہستہ آہستہ سِرکتی ہُوئی نیچے آ رہی تھی۔ درخت کی ایک شاخ سے اُترتے ہُوئے میرا پاؤں پھسلا تو جیپ بھی شور کرتی ہوئی نیچے کی طرف بڑھی، لیکن درخت کی ایک موٹی سی شاخ نے اُسے روک لیا۔ یہ چند لمحے میرے لِیے بہُت قیمتی تھے۔ میں نے وہیں سے چھلانگ لگائی اور سیدھا کھائی میں جاگرا۔ لیکن اِس سے قبل کہ میں وہاں سے اُٹھتا، جیپ شاخوں کو توڑتی ہوئی میرے سر پر آگئی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اُس جگہ سے ہٹنے کی کوشِش کی لیکن میری ٹانگ جیپ کے نیچے آگئی۔

تکلیف کے مارے میرے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ٹانگ کسی نے آری سے کاٹ دی ہو۔ جیپ اُلٹی گری تھی، اور میری ٹانگ اُس کی چھت کے نیچے پھنس گئی تھی۔

عین اُسی وقت اُوپر سے لوگوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ شاید وہ حادِثہ دیکھ کر رُک گئے تھے۔ معلوم نہیں ٹرک کا کیا بنا۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ کھائی میں نہیں گرا تھا، ورنہ مجھے اُس کا پتا ضرور چل جاتا۔ چند لمحوں بعد اُوپر سے ٹارچ کی روشنی کھائی میں ڈالی گئی، اور ساتھ ہی کسی کی آواز آئی "او بھائی! کہاں ہو؟"۔

یہ سُن کر مجھے اِس حالت میں بھی ہنسی آگئی۔ وہ تو اِس طرح پُوچھ رہا تھا جیسے میں نیچے سیر کے لِیے آیا ہُوں۔ بہرحال، میں نے بلند آواز سے کہا "میں یہاں ہُوں--- نیچے--- میری ٹانگ جیپ کے نیچے پھنسی ہوئی ہے"۔

جلد ہی تین آدمی رسّوں کی مدد سے نیچے کھائی میں اُتر آئے اور اُنھوں نے مجھے جیپ کے نیچے سے نکلنے میں مدد دی۔ میں چلنے کے قابِل نہ تھا، اِس لِیے اُوپر سے ایک تختہ منگوا کر اُنھوں نے مجھے اُس پر باندھا اور آہستہ آہستہ اُوپر کھینچ لیا۔ میری ٹانگ زخمی ہوگئی تھی لیکن ہڈّی نہیں ٹوٹی تھی۔

ٹرک دائیں طرف پہاڑی سے ٹکرا کر رُک گیا تھا۔ اُس کے ڈرائیور نے مجھ سے مُعافی مانگی "صاحِب، ہماری وجہ سے آپ موت کے مُنہ میں جاتے جاتے بچے۔ دراصل ٹرک کے بریک فیل ہو گئے تھے"۔

مجھے ایک دوسری گاڑی میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ راستے میں میں سوچ رہا تھا کہ ماں جی کی اُن دعاؤں نے مجھے بچا لیا جو اُنھوں نے مجھے رُخصت ہوتے وقت دی تھیں۔ ماں کی دُعا کتنی قیمتی ہوتی ہے؟ اِس کا تجربہ مجھے آج ہُوا تھا۔

اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیے
ماہنامہ تعلیم وتربیت
32 شارع بن بادیس لاہور

آخری قسط

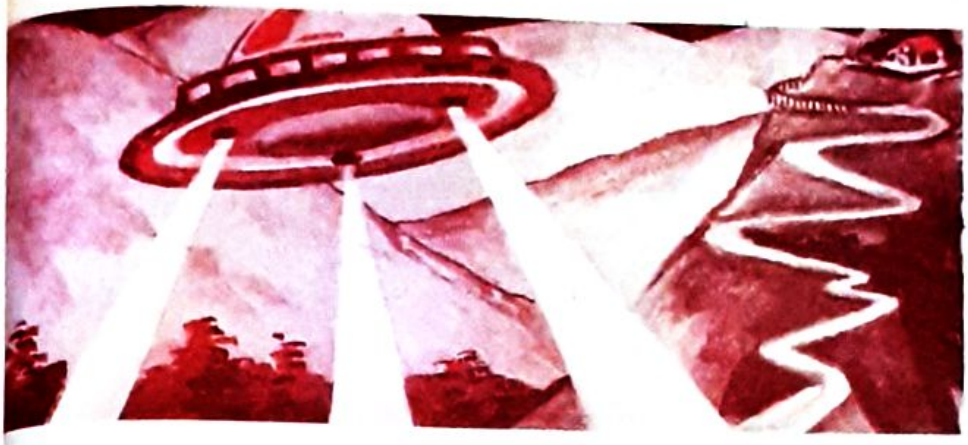

مِرّیخ کے مہمان

تحریر: جیاپراماسیون
ترجمہ: محمد یونس حسرت

اب تک کی کہانی

میکی اپنے دوست رُونی کے ساتھ چُھٹیاں گزارنے اپنے انکل، مسٹر بیرَن، کے پاس جاتا ہے۔ مسٹر بیرَن ایک دُور دراز پہاڑی پر اپنے بنگلے میں تنہا رہتے ہیں۔ ایک دن اُنھوں نے لڑکوں سے کہا "تم کبھی مشرقی پگ ڈنڈی کی طرف بھی گئے ہو؟ یہ پگ ڈنڈی بہت کم اِستعمال ہوتی ہے اور بہت سے لوگوں کو تو اُس کا عِلم بھی نہیں۔ وہاں سیر کا بہت لُطف آتا ہے۔ اُس کے آخری سِرے پر لکڑی کا ایک پُرانا کیبن ہے۔ اگر دیر ہو جائے تو تم اُس کیبن میں رات گزار سکتے ہو"۔

دونوں دوست اُس پگ ڈنڈی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کافی بلندی پر تھی اور اُس تک پہنچنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ لیکن اُنھوں نے ہمّت نہ ہاری اور گرتے پڑتے اُوپر چڑھتے چلے گئے۔ شام کا دُھندلکا پھیلنے لگا تھا کہ اچانک ایک غار میں سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے غار کے اندر گئے اور ٹارچ کی روشنی کراہنے والے پر ڈالی تو حیرت اور خوف سے اُچھل پڑے۔ غار کے ایک کونے میں ایک عجیب و غریب مخلُوق جو اِنسان تھی نہ حیوان، پڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔

اُس مخلوق نے اُنہیں بتایا کہ میرا نام ایاس ہے اور میں سیّارہ مِرّیخ کا ایک خلائی سائنس دان ہوں۔ خلائی تحقیق کے سلسلے میں میرا دُوسرے سیّاروں پر آنا جانا رہتا ہے۔ اِس مرتبہ میں مِرّیخ سے روانہ ہونے لگا تو مِرّیخ کا ایک بدمعاش، قراس، جس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی، میرے خلائی جہاز میں آکر چُھپ گیا۔ اُس نے مُجھ سے کہا کہ مجھے کسی دوسرے سیّارے میں لے چلو ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔ تمہاری زمین چُوں کہ مِرّیخ سے نزدیک ہے، اِس لِیے میں نے اپنا خلائی جہاز یہاں اُتار لیا اور پھر موقع پاکر بھاگ نکلا۔ اب وہ بدمعاش یہیں کہیں چُھپا بیٹھا ہوگا۔ وہ بہُت طاقت ور ہے۔ تم جیسے پچاس اِنسان بھی اُس پر قابو نہیں پا سکتے۔ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔

رُونی اور میکی نے ایاس کو بتایا کہ اُن کا اِرادہ اُس کیبن میں جانے کا ہے جو اِس پگ ڈنڈی کے آخری سرے پر بنا ہُوا ہے۔ ایاس نے اُنہیں وہاں جانے سے منع کیا اور کہا کہ ممکن ہے قراس اُس کیبن میں چُھپا بیٹھا ہو۔ لیکن رُونی اور میکی نے اُس کی بات نہ مانی۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ کیبن میں ضرور جائیں گے۔ اِس پر ایاس نے اُن کے سینڈوِچ میں ایک بٹن رکھ دیا اور کہا کہ جب تمہارا قراس سے آمنا سامنا ہو تو اِس بٹن کو دبانا۔ میں فوراً تمہاری مدد کو پہنچ جاؤں گا۔

رونی اور میکی کیبن کے پاس پہنچے تو اُس میں سے ایاس ہی کی طرح کی ایک مخلوق باہر نکلی اور اُس نے اُن دونوں کی کلائیاں اپنے فولادی ہاتھوں میں جکڑلیں۔ پھر اُس نے میکی کو دھکّا دے کر زمین پر گرا دیا اور رُونی کو اپنے ساتھ چلنے کا اِشارہ کر کے میکی سے کہا "میں تمہارے دوست کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے میرے بارے میں کسی کو بتایا تو میں اِسے مار ڈالوں گا"۔ اب آگے بڑھیے۔

میکی بے بس اور مجبور قراس اور رُونی کو جاتے دیکھتا رہا۔ اُسے ایاس کی طرف سے مدد پہنچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ وہ گھٹنوں کے بَل گر گیا اور مایوسی کی حالت میں زمین پر مُکّے مارنے لگا۔

"اوہ!" اُس نے مایوسی بھری آواز میں کہا "ہم نے ایاس کی بات کیوں نہ مان لی؟ ہم گھر واپس کیوں نہ چلے گئے؟ اب یہاں ہماری مدد کو کون آئے گا؟ انکل کو کیسے پتا چلے گا کہ ہم اس مُصیبت میں پھنس گئے ہیں؟ وہ ظالم قراس رُونی کو ساتھ لے گیا ہے۔ میں اُسے کیسے بچا سکوں گا اور اُس کو کچھ ہوگیا تو انکل کو کیا مُنہ دکھاؤں گا؟ اوہ! اوہ! ہائے! ہائے!" میکی اِسی طرح رو پیٹ کر اپنی مایوسی اور غُصّے کا اِظہار کر رہا تھا کہ اُسے اپنے ماتھے پر کسی ٹھنڈی ٹھنڈی چیز کا اِحساس ہُوا۔ اُس نے چونک کر نظریں اُوپر اُٹھائیں تو ایاس کو اپنے سامنے کھڑا پایا جو اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی اُنگلیوں سے اُس کی پیشانی کو چھُو رہا تھا۔ میکی نے دو تین بار یُوں آنکھیں جھپکیں جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر جب اُسے یقین ہوگیا کہ واقعی ایاس اُس کے سامنے کھڑا ہے تو اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگا:

"خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئے۔ وہ ظالم رُونی کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

میکی نے یہ الفاظ رُک رُک کر ادا کیے تھے۔ ایاس نے اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی اُنگلیوں سے اُس کی پیشانی کو سہلاتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں، میکی۔ حوصلہ رکھو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔

ایاس کی اُنگلیاں میکی کی پیشانی کو برابر سہلا رہی تھیں۔ اِس کے ساتھ ہی ایاس کی ہمدردانہ باتوں نے بھی اُس پر اثر کیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے آنسُو پونچھے اور حیرت بھری نظروں سے ایاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "آپ یہاں کیسے پہنچے؟"

ایاس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں اپنے خلائی جہاز کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے بٹن کی طرف سے سگنل موصول ہوئے اور میں بھاگ کر سیدھا یہاں آگیا۔ تم اِطمینان رکھو۔ ہم اب بھی اُن سے پہلے وہاں پہنچ سکتے ہیں کیوں کہ وہ سینڈوِچ میں چھُپا ہوا بٹن برابر سگنل بھیج رہا ہے۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ قراس تمہارے بجائے رُونی کو ساتھ لے گیا۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ خلائی جہاز کی طرف جا رہا ہے"۔

میکی ایک دم اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور بے قراری سے کہنے لگا "آیئے۔ میری راہ نُمائی کیجیے۔ میں جلد سے جلد رُونی کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں"۔

ایاس نے ایک نظر اُس سیدھی چٹان پر ڈالی جس کی طرف سے وہ آیا تھا، پھر اُس نے کہا "میری رائے میں ہم اِس راستے سے چلیں۔ یہ چڑھائی ہے تو ذرا سخت مگر اِس طرف سے جا کر ہی ہم قراس پر قابُو پا سکتے ہیں"۔

میکی ایاس کے ساتھ ہو لیا اور وہ گھنی جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے چڑھائی چڑھنے لگے۔ چڑھائی کی مُشقّت سے میکی کا سر چکرانے لگا تھا۔ اُس نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے اور مضبوط اِرادے کے ساتھ ایاس کے ساتھ قدم آگے بڑھاتا رہا۔ اُسے خیال تھا تو صِرف یہی کہ اُسے کسی نہ کسی طرح رونی کو اُس بدمعاش قراس کے پنجے سے رِہائی دلانا ہے۔

چلتے چلتے آخر وہ ایک کُھلی جگہ کے قریب پہنچ گئے۔ اِس جگہ درخت بہُت کم تھے۔ چاروں طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ ایاس نے تھوڑی دیر اِردگِرد کا جائزہ لیا، پھر میکی کی طرف مُڑا اور کہنے لگا "وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔ لیکن اُس پر عمل کرنے کے لِیے مجھے تمہاری مدد درکار ہوگی۔ کیا تم اِس کے لِیے تیّار ہو؟"

میکی ابھی تک ہانپ رہا تھا اور چڑھائی کی مُشقّت کے باعِث اُس کا سانس دُرست نہیں ہُوا تھا۔ اُس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا۔ ایاس نے تھوڑی دیر اپنے ریسیور پر وہ سگنل سُنے جو اُسے رُونی کے سینڈوِچ میں چھُپے ہوئے بٹن سے موصول ہو رہے تھے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اُس جگہ کی مُخالِف سمت اِشارہ کرتے

ہوئے کہا:

"وہ اِس طرف سے یہاں آئیں گے۔ جیسے ہی قراس پگ ڈنڈی سے اِس کھلی جگہ میں آئے، تمہیں اُس کی توجّہ ہٹانے کے لیے شور شرابا کرنا ہوگا۔ اِس طرح اُس کا دِھیان تمہاری طرف ہو جائے گا اور میں جھاڑیوں میں سے نکل کر اُسے پیچھے سے قابُو میں کرلوں گا۔ سمجھ گئے؟"

"جی، جی ہاں" میکی نے جواب دیا۔

ایاس نے اِطمینان کے انداز میں سر ہلایا اور جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ میکی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں اور کان اُس طرف لگے ہوئے تھے جس طرف ایاس نے اِشارہ کیا تھا۔ چاروں طرف غضب کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بند تھی اور درختوں کے پتّے تک نہیں سرسرا رہے تھے۔ پھر اچانک میکی نے قراس کی غصّے میں بھری ہوئی آواز سُنی۔ وہ شاید کسی اجنبی زبان میں گالیاں بک رہا تھا۔ میکی کا جسم تن گیا اور جب اُس نے قراس کو جھاڑیوں میں سے نِکل کر کُھلی جگہ کی طرف آتے دیکھا تو خوف کے مارے اُس کا گلا خُشک ہوگیا۔ قراس رُونی کو گھسیٹتا ہُوا لا رہا تھا اور رونی خوف کے باعث اَدھ مُوا سا دکھائی دے رہا تھا۔

میکی نے محسوس کیا کہ ایاس کی ہدایت کے مُطابق کارروائی کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اُس نے اپنے خوف پر قابُو پایا اور پوری قوّت سے چِلّایا "قراس!"

اِس کے ساتھ ہی وہ یُوں جھاڑیوں کی طرف بڑھا جیسے اُن میں چُھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس کے چِلّانے سے قراس گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا تاکہ معلوم کرسکے کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔

"قراس!" میکی ایک بار پھر پوری قوّت سے چِلّایا۔ پھر وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر مُکّے لہراتا ہُوا قراس کی طرف بڑھتے ہوئے چیخا "قراس! رُونی کو چھوڑ دو، قراس!"

قراس کو میکی سے اِتنی دِلیری کی توقّع بالکل نہ تھی۔ دو بالِشت کا لڑکا اور قراس کو یُوں للکارے؟ یہ اُس کی سمجھ اور برداشت دونوں سے باہر تھا۔ طیش میں آکر اُس نے رُونی کو ایک طرف دھکیلا اور زخمی چیتے کی طرح غُراتا ہُوا میکی کی طرف لپکا۔

میکی اُسے اپنی طرف آتے دیکھ کر رُک گیا۔ مگر جب وہ ذرا قریب آیا تو میکی ایک طرف کو مُڑ کر بھاگ کھڑا ہُوا۔ لیکن اِس سے پہلے کہ وہ جھاڑیوں تک پہنچ سکتا، قراس نے اُسے آلیا اور ایک ہاتھ سے کِھلونے کی طرح اُٹھا کر زمین پر دے پٹخا۔ میکی کا سر زمین سے ٹکرایا اور پھر اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اِس کے بعد اُسے اپنے آپ کی کوئی خبر نہ رہی۔

مگر عین اُس لمحے جب کہ قراس کی توجّہ میکی کی طرف تھی، ایاس جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور اُس نے بندوق

جیسی پچکاری سے کوئی دوا قراس کی طرف پھینکی۔ قراس ایک دم بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

میکی کو جلد ہی ہوش آگیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایاس اور رُونی اُس کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور قراس زمین پر بے ہوش پڑا ہے۔

"شاباش، میکی، شاباش!" ایاس نے میکی کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "تمہارا کام بڑا شان دار رہا۔ ایک دم لاجواب۔ یہ تمہاری بہادری کی وجہ سے ہی ممکن ہوا کہ میں قراس کو بے ہوش کرنے میں کام یاب ہوگیا۔ تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں، کوئی خاص نہیں" میکی نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا جس پر ایک لیموں جتنا بڑا گومڑا بن گیا تھا۔

"قراس مجھے اُٹھا کر پٹخنے لگا تو میری تو جان ہی نکل گئی۔ پر خیر، اب مجھے کسی بات کی پروا نہیں۔ مجھے تو خوشی اِس بات کی ہے کہ میں قراس پر قابُو پانے میں آپ کی مدد کر سکا"۔

رُونی آگے بڑھ کر میکی سے لپٹ گیا اور کہنے لگا "تُم نے تو ایک ہیرو کا سا کام کیا ہے میکی، ہیرو کا سا۔ مجھے بالکل اُمید نہ تھی کہ مجھے قراس کے پنجے سے اِتنی آسانی سے چھٹکارا مِل جائے گا"۔

پھر رونی نے اپنی سرگزشت سُنائی۔ قراس نے اُس کے ساتھ مار پیٹ نہیں کی تھی مگر اُس کے ساتھ چڑھائی چڑھنا اُس کے لیے ایک خوف ناک عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ تیز تیز چلتا تھا اور اُسے دم لینے کی مُہلت دیے بغیر اُسے اپنے ساتھ گھسیٹتا جاتا تھا۔

ایاس نے اپنے بازُو رُونی اور میکی کے گلے میں ڈال دیے اور بڑی گرم جوشی سے کہنے لگا "میں تم دونوں کا بے حد اِحسان مند ہوں۔ ایک تو تم نے میری خبر گیری کی، دوسرے تمہاری اِمداد کی بدولت میرے لیے قراس پر قابُو پانا ممکن ہوا۔ تم نہ ہوتے تو یہ کام نہ ہو سکتا تھا۔ اور پھر نہ جانے قراس کے ہاتھوں میرا کیا حال ہوتا، کیوں کہ اُس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں ہو سکتی"۔

یہ کہہ کر ایاس نے بے ہوش پڑے قراس کی طرف قدم بڑھائے اور رونی اور میکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "میری خواہش تھی کہ میں تم دونوں کے ساتھ سُکون اور اِطمینان کی چند گھڑیاں گُزارتا اور تمہاری محبّت اور مہمان نوازی کا لُطف اُٹھاتا۔ مگر اب مجھے جلد سے جلد واپس مِریخ پہنچنا ہے اور قراس کے دوبارہ ہوش میں آنے سے پہلے پہلے اِسے پولیس کے حوالے کرنا ہے"۔

وہ قراس کو اُٹھانے کے لیے جھکا تو رُونی اور میکی لپک کر اُس کے قریب آئے اور بولے "ہمیں بھی اِس کام میں ہاتھ بٹانے کی اِجازت دیں، جناب"۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے بے ہوش قراس کے پیر تھام لیے اور پھر ایاس اور وہ دونوں بے ہوش قراس کو اُٹھا کر جھاڑیوں کی طرف چلنے لگے۔ جلد ہی وہ جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے ایک کُھلی جگہ میں پہنچ گئے اور وہاں رُونی اور میکی کو جو کچھ دکھائی دیا، اُس سے اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

کُھلی جگہ کے بیچوں بیچ کسی چمک دار دھات کی بنی ہوئی ایک گول گاڑی کھڑی تھی۔ اُس کا اُوپر کا حِصّہ گُنبد کی طرح تھا اور یہ گُنبد ایک گول پلیٹ فارم پر ٹِکا ہُوا تھا۔ اِس پلیٹ فارم کے نیچے تین لمبی لمبی فولادی ٹانگیں تھیں جیسی کسی رِتپائی کی ہوتی ہیں۔ مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ ٹانگیں زمین پر ٹِکی ہوئی نہیں تھیں، زمین سے چار پانچ اِنچ اُونچی تھیں۔ اِن ٹانگوں کے نیچے سے بُخارات کی باریک دھار خارج ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وہ زمین پر ٹِکنے کی بجائے زمین سے اُوپر ہوا میں لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ ایاس کا خلائی جہاز تھا۔

ایاس نے بے ہوش قراس کو خلائی جہاز کے قریب زمین پر ڈال دیا۔ پھر وہ خلائی جہاز کی طرف بڑھا اور اُس کا ایک بٹن دبایا۔ اِس کے ساتھ ہی پلیٹ فارم کے نچلے حصّے

میں ایک خانہ کھُلا اور اُس میں سے اسٹریچر کی طرح کی ایک چیز باہر آئی۔ اُس کا اُوپر کا حِصّہ فوم کی طرح نرم تھا اور اُس کے پہلوؤں میں فولاد کی پٹریاں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایاس نے بے ہوش قراس کو اُس اسٹریچر پر ڈالا اور فولاد کی پٹریوں سے کس کر باندھ دیا۔ اِس کے بعد وہ پیچھے ہٹا اور خلائی گاڑی کا ایک اور بٹن دبایا تو اسٹریچر واپس پلیٹ فارم کے اندر پہنچ گیا اور پھر خود کار نِظام کے ذریعے اندر اور باہر دونوں طرف سے بند ہوگیا۔

رُونی اور میکی حیرت سے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایاس قراس کو خلائی جہاز کے اندر بند کرنے کے بعد کہنے لگا "لو بھئی' یہ کام تو ہوگیا۔ اب قراس پلیٹ فارم کے تہ خانے میں آرام سے سویا پڑا رہے گا' اور مِریخ واپس پہنچنے تک میرے لِیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرے گا"۔

پھر وہ اُن کے اِشتیاق بھرے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں جانتا ہوں کہ تم میرے خلائی جہاز کے بارے میں جاننے کے لِیے بے چین ہوگے۔ تم یہ جاننا چاہتے ہو گے کہ اِس کا انجن کیسا ہے' اِس کے اندر کون سا اِیندھن اِستعمال ہوتا ہے۔ تم اِس کے کل پُرزوں کے بارے میں بھی معلُومات حاصِل کرنا چاہتے ہوگے۔ مگر میرے دوستو' مجھے جلد سے جلد مِریخ واپس پہنچنا ہے' تاکہ قراس کے ہوش میں آنے سے پہلے اُسے پولیس کے حوالے کر دوں۔ لیکن میرا یہ وعدہ ہے کہ میں پھر کسی وقت یہاں آؤں گا اور تمہیں اپنے خلائی جہاز کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ بلکہ شاید میں تمہیں اُس میں بِٹھا کر خلا کی سیر بھی کرا سکوں۔ اُس وقت تک کے لِیے خدا حافِظ' میرے دوستو!"

"خدا حافظ!" رُونی اور میکی نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

ایاس خلائی جہاز کی طرف بڑھا اور اُس نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی چوڑی پیٹی میں لگا ہُوا ایک بٹن دبایا۔ خلائی جہاز کے اندر سے ایک چھوٹی سی فولڈنگ سیڑھی نیچے آئی اور ایاس اُس سیڑھی پر آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہُوا اُوپر پہنچ گیا۔ اُس کے اندر پہنچنے کے بعد سیڑھی بھی خود بخود اندر پہنچ گئی۔

رُونی اور میکی پیچھے ہٹ کر جھاڑیوں میں چلے گئے۔ اُنھوں نے اپنی سائنس کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ خلائی جہاز کے نچلے حصّے سے راکٹ فائر کیے جاتے ہیں جس سے خلائی جہاز فضا میں بلند ہوتا ہے۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ شُوں کی ایک ہلکی سی آواز آئی، خلائی جہاز کی فولادی ٹانگیں جہاز کے نچلے حصّے میں اپنی جگہ چلی گئیں اور خلائی جہاز خاموشی سے فضا میں بلند ہونے لگا۔

رُونی اور میکی سانس روکے کھڑے تھے۔ اُن کی نظریں بلند ہوتی ہُوئی خلائی گاڑی پر جمی ہوئی تھیں جو اَب ہلکے سبز رنگ کی روشنی میں یُوں چمک رہی تھی جیسے یہ اُس کا اَلوداعی اِشارہ ہو۔ چند لمحوں بعد وہ درختوں کے اُوپر سے ہوتی ہوئی آسمان کی وُسعتوں میں غائب ہو گئی۔

"لو بھئی، گئے ہمارے دونوں مِریخی مہمان" میکی نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں، ایاس بھی اور وہ کم بخت قراس بھی" رُونی نے جواب میں کہا۔

پھر وہ آہستہ سے اُٹھے اور جھاڑیوں سے نِکل کر کُھلی جگہ میں آگئے۔ بے اِختیار اُن کی نظریں ایک بار پھر اُوپر اُٹھ گئیں۔ مگر اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اُنھوں نے حیرت اور بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے دِلوں میں اُس وقت ایک ہی خیال گردِش کر رہا تھا۔ میکی نے پہلے زبان کھولی۔ اُس نے کہا "رُونی، کیا واقعی وہ مِریخ والے یہاں آئے تھے؟ ہم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا تھا؟"

"کون جانے!" رُونی نے آہستہ سے جواب دیا "دُنیا میں کبھی خواب حقیقت بن جاتے ہیں اور کبھی حقیقتیں خواب نظر آنے لگتی ہیں"۔

"نہیں، یہ خواب نہیں ہو سکتا۔ یہ سارا واقِعہ سچ مُچ ہمارے ساتھ پیش آیا ہے" میکی نے اپنے سر کے گومڑے پر ہاتھ پھیر کر کہا "یہ واقِعہ حقیقت نہ ہوتا تو میرے سر میں یہ گومڑا کیسے بنتا؟ ایاس اور قراس کا یہ سارا واقِعہ حقیقت ہے، افسانہ یا خواب نہیں"۔

"مگر افسانے سے کہیں زیادہ دِل چسپ اور ناقابلِ یقین ہے" رُونی نے جواب میں کہا "لوگوں کو شاید ہی اِس کا یقین آئے"۔

"کسی کو یقین نہیں آتا تو نہ آئے" میکی نے رُونی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا "ہم تو اِس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہم نے ایک زخمی مِریخی سائنس دان کی مدد کی اور ایک مِریخی مُجرِم کو قانُون کے حوالے کرنے میں مددگار ثابت ہوئے"۔

"ہاں، یہ تو واقعی ایک قابلِ فخر بات ہے" رُونی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں خوشی اور فخر سے سرشار لکڑی کے کیبن کی طرف روانہ ہوگئے کیوں کہ اُن کے تھیلے اور دوسرا سامان وہیں کیبن کے باہر پڑا تھا جسے قراس نے اُن کی تلاشی لیتے ہوئے اِدھر اُدھر پھینک دیا تھا۔ (ختم)

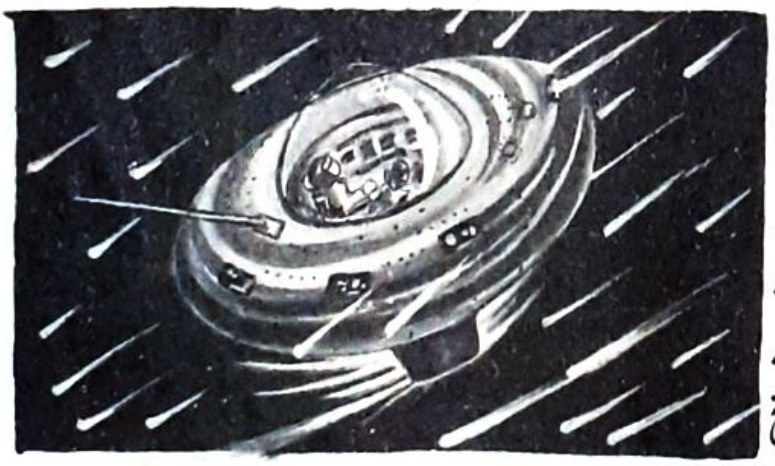

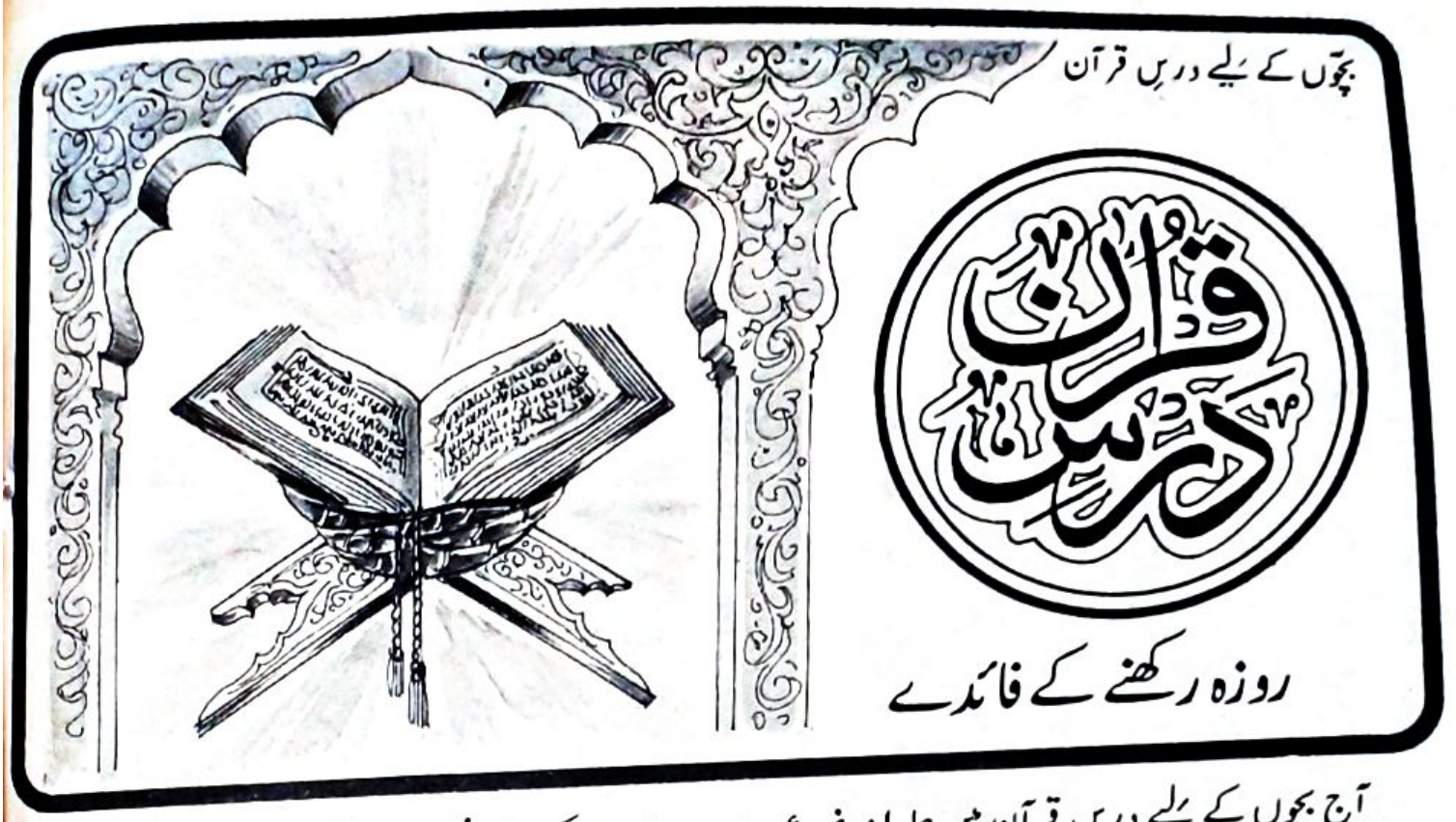

بچوں کے لیے درسِ قرآن

درسِ قرآن

روزہ رکھنے کے فائدے

آج بچوں کے لیے درسِ قرآن میں ہمارا موضوع ہے "روزہ رکھنے کے فائدے"۔

موضوع کی وضاحت کے لیے ہم نے سُورہ بقرہ کی آیت نمبر184 کا یہ جُملہ منتخب کیا ہے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ

ترجمہ: اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔

روزہ اِسلام کا بہت ضروری اور بہت مُفید عمل ہے۔ روزہ رکھنا ہر اُس مسلمان پر فرض ہے جس میں روزہ رکھنے کی ہمت اور اہلیت ہو۔ جان بُوجھ کر روزہ چھوڑنے والا مسلمان کہلانے کا حق دار نہیں۔

اِسلام کے باقی فرضوں کی طرح روزے کے بھی بے شمار فائدے ہیں۔ چند اہم رُوحانی، جسمانی، نفسیاتی اور مُعاشرتی فائدوں کا خُلاصہ یوں ہے۔

سب سے بڑا روحانی فائدہ یہ ہے کہ روزہ دار میں نیکی اور بھلائی کے لیے بہت بڑی قوّت پیدا ہو جاتی ہے۔

روزے کے جسمانی فائدے بھی بے شمار ہیں۔ وقت بے وقت چرتے رہنے سے معدہ اور جسم کے باقی حصّوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ کھانے پینے پر کچھ عرصہ قابو پانے سے جسم کی مشین پہلے سے کہیں بہتر کام کرنے لگتی ہے۔ سب سے اہم نفسیاتی فائدہ یہ ہے کہ روزہ دار میں قوّتِ اِرادی اور ضبط و تحمّل کے اوصاف پُختہ ہو جاتے ہیں۔ روزے کے مُعاشرتی فائدوں کی فہرست تو بڑی لمبی ہے۔ روزہ دار کو اُن لوگوں سے عملی ہمدردی ہو جاتی ہے جو غُربت کی وجہ سے بھوکے رہنے پر مجبور ہیں۔ روزے کے دوران میں سب لوگ نظم و ضبط کا ایک جیسا راستہ اِختیار کرتے ہیں۔ اِس سے یک جہتی، تعاوُن اور اِتّحاد کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ الغرض روزہ رکھنے میں فائدے ہی فائدے ہیں۔

اگر بچّے اِبتدائی عمر ہی سے روزہ رکھنے کی عادت ڈال لیں، تو وہ تن درستی، نظم و ضبط اور خود اِعتمادی کی نعمتوں سے مالا مال ہو سکتے ہیں۔ یہ اوصاف اچھّی، خوش اور کام یاب زندگی گزارنے میں بہت کام آتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدُالرّؤف

دانائی کی باتیں

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

پیارے بچّو، آج میں آپ کو چند چھوٹی چھوٹی کہانیاں سُنانا چاہتی ہوں۔ ایسی کہانیوں کو افسانچے بھی کہتے ہیں۔ سب سے پہلے میں دُنیا کا اِنعام یافتہ مختصر ترین افسانچہ سُناتی ہوں۔

ریل گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ ایک ڈبّے میں ایک مسافر اکیلا بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص اُس کے پاس بیٹھا ہے۔ مسافر نے مُنہ موڑا تو اُس شخص نے پُوچھا "کیا آپ بھوتوں پر یقین رکھتے ہیں؟"

مسافر نے جواب دیا "نہیں"۔ یہ سُن کر وہ شخص غائب ہوگیا۔

سنہری چڑیا بولی :

بچّو، دیکھا آپ نے؟ کتنا مختصر اور دل چسپ افسانچہ تھا۔ کوئی ساٹھ ستّر سال اُدھر کی بات ہے، اِس کو دنیا کا مختصر ترین افسانہ تسلیم کیا گیا اور افسانہ نویس کو اوّل اِنعام ملا۔

اب میں آپ کو موچی اور جوہری کی ایک کہانی سُناتی ہوں۔

اِمام ابُو حنیفہؒ کے بہت سے شاگرد تھے۔ اِن میں ایک قابل شاگرد کا نام احمد تھا۔ وہ غریب والدین کا بیٹا تھا۔ ایک دن وہ گھر سے اپنے اُستاد کے درس میں شامل ہونے کے لیے جا رہا تھا کہ اُس کی جُوتی ٹوٹ گئی۔ وہ موچی کی دکان پر پہنچا اور اُس سے کہا کہ میری جوتی کی مرمّت کر دو۔

موچی نے کہا "ایک پیسہ لگے گا"۔

احمد بولا "اِس وقت تو میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ اِن شاءاللہ کل اِسی وقت آپ کو دے دوں گا"۔

موچی نے کہا "مجھے اُدھار نہیں، نقد پیسہ چاہیئے"۔

احمد نے مِنّت سے کہا "دیکھو، میں اِمام ابو حنیفہؒ کا شاگرد ہوں۔ وعدہ ضرور پورا کروں گا"۔

موچی نے پھر نکا سا جواب دیا "یہاں اُدھار نہیں چلتا"۔

یہ سُن کر احمد کو سخت رنج پہنچا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے اُستادِ مُحترم کی خدمت میں پہنچ گیا۔ درس سے فارغ ہوئے تو امام ابو حنیفہؒ نے اپنے اِس قابل اور چہیتے شاگرد سے پوچھا "احمد، کیا بات ہے آج تم غم زدہ نظر آ رہے ہو؟"

احمد نے جُوتی اور موچی کا قصّہ سُنایا۔ اِمام صاحِب نے کہا کہ یہ لعل لو اور موچی سے جاکر کہو کہ ایک پیسے کے عِوَض یہ لے لو اور میری جُوتی گانٹھ دو۔ پھر واپس آکر مجھے بتانا کہ موچی نے تمہاری بات مانی کہ نہیں۔

احمد نے ایسا ہی کیا۔ لیکن موچی نے لعل کو دیکھ کر کہا "لے جاؤ اِس بے کار پتّھر کو، اور ایک پیسہ لاؤ"۔

احمد نے واپس آکر اپنے اُستادِ مُحترم کو یہ بات بتائی تو اُنھوں نے کہا "فلاں جوہری کے پاس اِسے لے جاؤ اور پُوچھو کہ وہ اِس کی کیا قیمت دے گا؟"

احمد جوہری کے پاس گیا اور اُسے لعل دکھایا تو وہ اُسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ بولا "دس ہزار اشرفیاں لو اور یہ لعل مجھے دے دو"۔

احمد یہ سُن کر اِمام صاحِب کے پاس آیا اور اُنھیں جوہری کی بات بتائی۔ امام صاحِب نے احمد سے کہا "برخوردار، جس طرح لعل و جواہر کی قدر اور قیمت جوہری ہی جانتے ہیں، اِسی طرح عِلم کی قدر و قیمت جاہِل نہیں، عالِم ہی جانتے ہیں۔ موچی بے چارہ عِلم کی روشنی سے محروم تھا۔ وہ عالِم، طالبِ عِلم اور عِلم کی قدر کیسے کر سکتا تھا؟

سُنہری چڑیا نے کہا، بچّو، آپ کو یہ کہانی یقیناً پسند آئی ہوگی۔ سچ ہے، جاہل کیا جانیں عِلم کی قدر۔

اب میں آپ کو ایک اور سچّا واقعہ سُناتی ہوں۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ کا اِرشاد ہے "پنگوڑے سے قبر

تک علم حاصل کرتے رہو"۔

اِس اِرشاد کا یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں کو بچپن سے آخری دم تک علم حاصل کرتے رہنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ بی اے یا ایم اے کر کے یا کسی مذہبی مدرسے سے سند حاصل کر کے مزید علم حاصل کرنا چھوڑ دو۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا یہ نعرہ اور مقصد ہونا چاہیئے: علم، علم اور علم۔

اب میں البیرُونی کا ایک سچّا واقعہ سُناتی ہوں۔ البیرونی اپنے زمانے کا بہُت مشہور عالم فاضل، حکیم اور ریاضی دان تھا۔ بدقسمتی سے اُسے ایک مُوذی مرض لاحق ہوگیا۔ طبیبوں نے اُس کی جان بچانے کی بہت کوشش کی، مگر بے سُود۔ اُس کا ایک دوست جو بہُت بڑا ریاضی دان تھا، اُس کی عیادت کو آیا۔ البیرونی کا آخری وقت تھا، لیکن اُسے علم حاصل کرنے کا اِتنا شوق تھا کہ اُس نے دوست سے کہا "مجھے الجبرا کا ایک مسئلہ سمجھا دو"۔

دوست نے کہا "البیرُونی، تمہارا آخری وقت ہے۔ یہ مسئلہ سیکھنے کا کیا فائدہ؟"

البیرونی نے جواب دیا "میں یہ علمی مسئلہ سیکھ کر مرنا چاہتا ہوں"۔

دوست نے البیرونی کی خواہش کے مُطابق اُسے وہ مسئلہ سمجھا دیا۔ اُس کا کہنا ہے کہ میں ابھی البیرونی کے گھر سے نکل کر چند قدم چلا تھا کہ عورتوں کے رونے کی آواز آئی۔ البیرونی اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔

بچّو، اب میں آپ کو اپنے مُلک کے ایک مشہور شاعر کا سچّا قِصّہ سُناتی ہوں۔ ہمارا یہ شاعر ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور لاہور کے اِسلامیہ کالج میں ایف اے میں پڑھتا تھا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر گیا تو ایک دن دوپہر کے وقت، وہاں ایک نجومی آگیا۔ گاؤں کی عورتیں اُسے قِسمت کا حال پُوچھنے کی خاطر ہاتھ دکھانے لگیں۔ شاعر نے بھی ہاتھ دکھایا۔ نجومی نے ہاتھ دیکھ کر کہا "بچّہ، تم میٹرک سے آگے نہیں پڑھو گے۔ تمہاری قِسمت میں اِتنا ہی علم ہے"۔

شاعر نے کہا "بابا جی، میں تو ایف اے میں پڑھتا ہوں"۔

نجومی نے جواب دیا "بچّہ، تُم چاہے ایم اے کرلو، رہو گے میٹرک ہی"۔

ویسے واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو صرف ڈگری کی خاطر پڑھتے ہیں۔ اُن کو علم حاصل کرنے کا شوق نہیں ہوتا۔ اِس لیے ایم اے کرنے کے بعد بھی اُن کی علمی قابلیّت میٹرک کے طالبِ علموں جیسی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچّے طالبِ علم وہ ہوتے ہیں جو عمر بھر طالبِ علم رہتے ہیں، یعنی علم حاصل کرتے رہتے ہیں۔

پیارے بچّو، اب میں ایک لالچی آدمی کی کہانی سُناتی ہوں جس کو لالچ نے خاک میں مُلا دیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنے ایک لالچی درباری سے پُوچھا "تمہیں زمین بہُت پیاری ہے؟"

اُس نے جواب دیا: "جی، حضُور"۔

بادشاہ نے کہا "فُلاں زمین خالی ہے اور وہ بہُت لمبی چوڑی ہے۔ تم دوڑ کر جتنی زمین کو گھیر لو گے، وہ تمہاری ہوگی"۔

یہ سُن کر لالچی درباری بے حد خوش ہُوا۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے بادشاہ کے وزیر اور درباری بھی اُس لالچی درباری کے ساتھ اُس زمین پر گئے۔ درباری نے زمین کا جائزہ لیا اور زیادہ سے زیادہ زمین لینے کے لیے ایک بہت بڑے چکّر میں دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے تھک کر چُور ہو جاتا تو ستانے کے لیے بیٹھ جاتا، اور پھر دوڑنے لگتا۔ دوڑتے دوڑتے اُس کا سانس پھول گیا اور وہ ہانپنے لگا۔ آخر کار، اُدھر سورج غرُوب ہونے لگا، اِدھر لالچی درباری ہانپتے ہانپتے زمین پر گر پڑا اور اُس کی زندگی کا آفتاب بھی غرُوب ہوگیا۔

اِسی لیے یہ قول جتنا مشہور ہے اُتنا سچّا بھی ہے کہ لالچ بُری بلا ہے۔

بلّی

ضیغم حمیدی

بچّو، تم نے دیکھی ہوگی بھولی بھالی بِلّی
گورے، کالے، پیلے، بھورے، رنگوں والی بِلّی
اِدھر اُدھر گھر کے کمروں میں یہ آئے اور جائے
اِس کی شیر سے مِلتی جُلتی صورت دِل کو بھائے
دُودھ کا اپنے سامنے دیکھے جب یہ ایک پیالہ
غٹر غٹر پی جائے سارا نٹ کھٹ شیر کی خالہ
کبھی یہ الماری پر چڑھ کر دھم سے میز پہ کُودے
باورچی خانے میں یہ کھانے کی چیزیں ڈھونڈے
خوب کہاوت ہے "کھسیانی بِلّی کھمبا نوچے"
چُوہے کو فوراً کھا جائے، کچھ نہ کبھی یہ سوچے
چاہے پاکستانی بِلّی ہو یا ضیغم رُوسی
کوئی بُلائے "مانو" کہہ کر، کوئی پُکارے "پُوسی"

ایک پتھر

اِحفاظُ الرّحمان

ایک رات پہاڑوں کے اُوپر طوفانی بادل چھا گئے اور بجلی کڑکنے لگی۔ اِتنی بارش ہوئی کہ نالے بھر گئے اور دریا سے جا ملے۔ دریا نیچے گھاٹیوں میں ہوتا ہوا تیزی سے بہنے لگا۔ اُس نے ہر چیز کو تباہ کر دیا۔

ایک چٹان سے ایک بہت بڑا پتّھر ٹوٹ گیا۔ وہ کچھ دیر، خوف زدہ سا، تنگ پہاڑی سڑک کے اُوپر لٹکا رہا اور پھر ایک خوف ناک آواز کے ساتھ سڑک کے بیچوں بیچ آگرا۔

صبح کو آسمان پر چمکیلا سورج نکلا۔ شبنم کے قطرے درختوں کے پتّوں پر جگ مگانے لگے۔ گھاس جو دب گئی تھی، پھر سر اُٹھانے لگی۔ اِتنے میں گاؤں کی طرف سے ایک چھکڑا نمودار ہوا۔ اُسے نوکیلے سینگوں والی دو سیاہ بھینسیں کھینچ رہی تھیں۔ چھکڑے کے اندر ایک آدمی بیٹھا اپنی دُھن میں مگن سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ ایک پنساری تھا اور نمک اور کولتار خریدنے شہر جا رہا تھا۔ موڑ پر پہنچ کر، جہاں بڑا پتّھر پڑا ہوا تھا، اُس نے چھکڑا روک لیا، کیوں کہ پتّھر نے پورا راستہ روک رکھا تھا۔ بائیں طرف دریا بہ رہا تھا اور دائیں جانب بلند چٹانیں سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔

پنساری پہلے تو سر کھجاتا رہا۔ پھر نیچے اُتر کر پتّھر کے پاس گیا۔ اُس نے اُسے پاؤں سے ٹھوکر لگائی، پیٹھ سے زور لگایا لیکن پتّھر ہلا تک نہیں۔

"یہ مجھ سے نہیں ہٹے گا۔ کسی ایسے شخص کا اِنتظار کرنا پڑے گا جو مجھ سے زیادہ طاقت ور ہو"۔

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ایک چھڑی اُٹھائی اور اُس سے زمین پر پھول پتّیاں بنانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا چھکڑا وہاں آ پہنچا۔ اُس پر جلانے کی لکڑیاں لدی ہوئی تھیں۔

لکڑی والے نے پنساری سے کہا "ارے بھائی، تم نے اپنا چھکڑا سڑک کے بیچوں بیچ کیوں کھڑا کر رکھا ہے؟ اِسے ایک طرف کر لو تاکہ میں گزر سکوں۔ میں بہت جلدی میں ہوں"۔

پنساری بولا "تمہیں جلدی ہے تو پہلے یہاں آکر یہ چٹان ہٹاؤ۔ پھر چلے جانا"۔

"کیسی چٹان؟"

"یہاں آؤ۔ یہ دیکھو۔ چھکڑوں کے آگے پڑی ہوئی ہے"۔

لکڑی والے نے نیچے اُتر کر پتّھر کو دیکھا اور پھر اپنی موٹی واسکٹ اُتار کر پتّھر کو دائیں بائیں ہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن پتّھر نہیں ہلا۔

"یہ اپنے بس کی بات نہیں" وہ سر ہلاتا ہوا بولا "ہمیں کسی طاقت ور آدمی کا اِنتظار کرنا پڑے گا۔ وُہی ہمارا راستہ صاف کرے گا"۔

لکڑی والا پنساری کے برابر بیٹھ گیا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک گھوڑا گاڑی والا آ پہنچا۔ وہ بہت بوڑھا تھا۔ اُس کی کمر جُھکی ہوئی تھی۔ وہ بڑی بے دردی سے گھوڑے پر چابک برسا رہا تھا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ دونوں چھکڑے کیوں کھڑے ہوئے ہیں تو وہ اول فول بکتا ہوا اپنی گاڑی سے اُترا اور مُرغے کی طرح پتّھر کے گرد پھدکنے لگا۔ پھر چپ چاپ اُن دونوں کے پاس بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دو چھکڑے اور آئے، جن پر کمبل اور

مٹی کے برتن لدے ہوئے تھے۔ اُن کے مالکوں کو بازار پہنچنے کی جلدی تھی۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ راستہ بند ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

اُن میں سے ایک بڑا غُصیلا تھا۔ وہ پتّھر کو سزا دینے کے لیے اُس پر چابُک برسانے لگا۔ وقت گزرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ اب وہاں ایک پُورا قافلہ جمع ہو چکا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک اپنی قُوّت آزماتے رہے، لیکن اُن میں سے کوئی بھی پتّھر کو نہ ہِلا سکا۔

اِتنے میں ایک چھوٹے سے قد کا بُوڑھا اُدھر سے گزُرا۔ اُس کے کندھے پر ایک چھڑی رکھی تھی، جس پر خوبانیوں سے بھری ہوئی ٹوکری لٹکی ہوئی تھی۔ اُس نے چھکڑے والوں کو سلام کیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

ایک چھکڑے والے نے کہا "تُمہارے مزے ہیں۔ تمہارے پاس کوئی چھکڑا نہیں ہے۔ اِس لیے تُم آسانی سے گزُر جاؤ گے"۔

"تُم بھی گزُر سکتے ہو" بُوڑھا اُن کی طرف مُڑتے ہوئے بولا۔

"ہم کیسے گزُر سکتے ہیں؟"

"اِس کے لیے تُمہیں اپنی عقل اِستعمال کرنی چاہیئے" بُوڑھا بولا۔

"ہمیں عقل کی نہیں، طاقت کی ضرورت ہے" ایک شخص نے کہا "ہم سب پتّھر کو ہِلانے کی کوشش کر چکے ہیں، لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہُوئی"۔

"تم سب مِل کر اِسے ہٹانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اگر تم کسی دیو کا اِنتظار کر رہے ہو کہ وہ آکر پتّھر ہٹا دے گا تو پھر تُمہیں قیامت تک اِنتظار کرنا پڑے گا"۔

"ٹھیک ہے" گھوڑا گاڑی والا بول اُٹھا "آؤ، بھائیو۔ ہم سب مِل کر زور لگائیں"۔

سب لوگ پتّھر کے گِرد جمع ہو گئے اور اُسے دھکیلنے لگے۔ پتّھر نیچے کی طرف لُڑھکتا ہُوا ایک خوف ناک آواز کے ساتھ گہرے کھڈ میں گرا اور پاش پاش ہو گیا۔

اب راستہ صاف تھا۔ چھکڑے آسانی سے گزُر گئے۔

آپ جانتے ہیں؟

☆ ہمارا نِظامِ شمسی (سولر سسٹم) سُورج، سیّاروں، طُفیلی سیّاروں اور دُم دار تاروں سے مِل کر بنا ہے۔ اِس میں ایک سُورج، 9 سیّارے، 48 طُفیلی سیّارے (جو سیّاروں کے گِرد گھومتے ہیں) اور بے شمار دُم دار تارے اور کنکر پتّھر اور دھاتوں کے جُھنڈ ہیں۔ اِس کے عِلاوہ 4,000 کے لگ بھگ اُن مصنُوعی سیّاروں کے ٹکڑے بھی ہیں جو امریکا اور روس نے خلا میں چھوڑے تھے۔

☆ سورج سے زمین کا فاصِلہ، زمین اور چاند کے درمیانی فاصلے سے 385 گُنا زیادہ ہے۔

☆ ایک ٹن یورینیم اُتنی ہی توانائی پیدا کر سکتی ہے جتنی 30,000 ٹن کوئلا پیدا کر سکتا ہے۔

☆ دودھ کریم (بالائی) سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

☆ اِنسان ایک مِنٹ میں 25 بار پلکیں جھپکتا ہے۔

☆ ہر چار ہفتے بعد ہماری اُوپر کی جِلد جھڑ جاتی ہے۔

☆ کستورا مچھلی (Oyester) کو ایک درمیانہ درجے کا موتی بنانے میں سات سال لگتے ہیں۔

☆ فرانس کے ایک گاؤں، ترو، میں ایک ایسا کُنواں ہے جس میں سے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔

☆ بطخیں صبح کو انڈے دیتی ہیں۔

☆ سعودی عرب ریت اِسکاٹ لینڈ سے اور اُونٹ شمالی افریقہ سے درآمد کرتا ہے۔

☆ "برازِیل نَٹ" ایک درخت کا نام ہے، جو جنُوبی امریکا کے ایک مُلک، برازیل، میں پایا جاتا ہے۔ اِس ملک کا نام (برازِیل) اِسی درخت کے نام پر رکھا گیا تھا۔

خوف کی وہ رات

شکیل زاہد

رائفل اُٹھا کر میں نے دروازے سے باہر قدم نکالا تو مجھے اِحساس ہوا کہ میں اب بوڑھا ہو چلا ہوں۔ سردی کی ایک شدید لہر نے میرے جسم کو آدبوچا تھا۔ اگرچہ میں نے لمبا گرم کوٹ، گرم جوتے اور اُونی ٹوپی پہنی ہوئی تھی مگر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے مجھے برف کی سِل کے سامنے کھڑا کر کے پنکھا چلا دیا ہے۔ مجھے یاد ہے، آج سے پندرہ سولہ سال پہلے میں اِسی موسم میں صرف شلوار قمیص پہن کر گھوما کرتا تھا اور مجھے سردی کا پتا بھی نہ چلتا تھا۔

باہر ہلکی ہلکی دُھند چھائی ہوئی تھی۔ گزشتہ رات برف باری ہوئی تھی۔ ابھی دو گھنٹے پہلے تک سم سم سک سک کی آواز کے ساتھ آسمان سے برف کے گالے برس رہے تھے۔ صبح کے دس بجے بھی یوں لگتا تھا گویا رات ہونے والی ہے۔ میں نے دروازے میں تالا لگایا اور مُڑ کر سامنے پہاڑوں پر نظر دوڑائی۔ دُور دُور تک برف ہی برف اور برف سے ڈھکے ہوئے درخت نظر آ رہے تھے، اور سامنے والے پہاڑ پر وہ جنگل تھا جہاں راجُو چُھپا ہوا تھا!

راجُو کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ابھی چند مِنٹ پہلے وائرلیس پر یہ اِطّلاع ملی تھی کہ اِس جنگل میں راجُو نام کا ایک بھگوڑا قیدی چُھپا ہوا ہے۔ پولیس کئی دن سے اُسے تلاش کر رہی تھی، مگر ناکامی ہوئی تھی۔ اِس کی ایک وجہ تو وہ شدید سردی تھی جو ہڈّیوں میں اُتر جاتی تھی اور دوسرے وہ جنگل بے حد گھنا تھا۔ دن کے وقت بھی وہاں رات کا سا سماں ہوتا تھا۔ راجو غالباً اِسی علاقے یا ایسے ہی کسی پہاڑی عِلاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ خوب جانتا ہو گا کہ پہاڑی جنگل میں خود کو چُھپانے کے کیا کیا طریقے ہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اُس نے چُھپنے کے لِیے کسی ایسے غار کو چُنا ہو گا جو گھنی جھاڑیوں سے ڈھکا ہُوا ہو۔ ایسے غار پہاڑی عِلاقوں میں عام پائے جاتے ہیں۔ پولیس والے اُسے درختوں کے جُھنڈوں میں تلاش کر رہے ہوں گے اور وہ کسی غار میں آرام سے بیٹھا اُن پر ہنس رہا ہو گا۔

میں اِس علاقے میں گزشتہ 25 برس سے رہ رہا تھا۔ یہ میرا اپنا عِلاقہ تھا اور میں اِسے خوب جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس نے راجو کا کھوج لگانے کے لِیے میری خِدمات حاصِل کی تھیں۔

جنگل میرے گھر سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور وہاں تک ایک کچّی سڑک جاتی تھی۔ مگر اُس وقت جب کہ

ہر چیز برف کی موٹی تہ میں دبی ہوئی تھی' سڑک کو تلاش کرنا آسان نہ تھا۔ میں اِس جنگل میں کبھی کبھار ہی گیا تھا۔ میرا کام زیادہ تر پہاڑ اور وادی تک ہی رہتا تھا اور یہ تمام راستے مجھے ازبر تھے۔ برف باری میں بھی مَیں اِن پر آسانی سے سفر کر لیتا تھا۔

میں نے ایک ہاتھ میں برف پر چلنے والی چھڑی پکڑ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے کاندھے پر ٹنگی ہوئی رائفل تھام رکھی تھی۔ میں نے جُوں ہی پہاڑ سے نیچے اُترنا شروع کیا' مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں اُس کچّی سڑک سے ہٹ گیا ہوں۔ یہاں برف گھٹنوں گھٹنوں تک تھی۔ جن لوگوں کو برف پر چلنے کا اِتّفاق ہوا ہے' وہ جانتے ہوں گے کہ گھٹنوں گھٹنوں برف پر چلنا کسی قدر دُشوار کام ہے۔

"راشِد کو بھی آج ہی غائب ہونا تھا" میں نے بڑبڑا کر اپنے نائب کو کوسا۔

راشد نوجوان تھا اور اِس راستے سے مجُھ سے زیادہ واقِف تھا۔ مگر وہ شاید گھر میں لحاف میں دبکا مونگ پھلیاں کھا رہا ہوگا اور میں یہاں سردی میں اکڑ رہا تھا۔

اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گرتا چلا گیا۔ میری آنکھوں' ناک اور کانوں میں برف گھُس گئی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر لُڑھکنے کے بعد میں رُکا۔ آنکھوں پر سے برف صاف کی تو دیکھا کہ میں نیچے وادی میں پہنچ گیا ہوں۔ چھڑی نہ جانے راستے میں کہاں رہ گئی تھی' رائفل البتّہ میرے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا' رائفل کے بغیر ایک خطرناک مجُرِم کا مقابلہ کرنا بے حد دُشوار ہوتا۔

قلابازیاں کھانے کے دوران میں میرا سر کسی پتّھر سے ٹکرا گیا تھا۔ اُس میں درد کی شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دِیے مگر درد دُور نہیں ہُوا۔ کھڑا ہُوا تو سر چکرا گیا' مگر جلد ہی حالت سنبھل گئی۔ اِس جگہ برف کی تہ زیادہ موٹی تھی۔ میں نے قدم اُٹھایا تو میری دوسری ٹانگ گھٹنے تک برف میں دھنس گئی۔ میں نے رائفل اُتاری اور اُسے سہارے کے لِیے اِستعمال کیا۔

جُوں جُوں چڑھائی بڑھ رہی تھی' برف کی تہ پتلی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن سردی کا یہ عالَم تھا کہ میرا چہرہ' ہاتھ اور پاؤں کی اُنگلیاں بِالکُل سُن ہوگئی تھیں۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں واپس چلا جاؤں مگر فرض تو ہر حالت میں ادا کرنا تھا۔

یوں بھی اُس وقت برف باری رُکی ہوئی تھی۔ اگر کل دوبارہ ڈیوٹی لگ گئی اور برف باری بھی شروع ہوگئی تو کیا کروں گا؟ یہ سوچ کر میں آگے بڑھتا رہا۔

جنگل کے پاس برف میری پنڈلیوں تک تھی۔ مگر اب چڑھائی دُشوار ہوگئی تھی۔ پہاڑی چٹانیں یوں اُوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں جیسے آسمان کو دیکھ رہی ہوں۔ اگر میں نے اِس عِلاقے میں ایک عُمر نہ گزاری ہوتی تو کبھی کا کسی کھائی میں گر کر ختم ہو چکا ہوتا۔ جنگل آہستہ آہستہ گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ برف کی تہ اور باریک ہوگئی تھی۔ مگر اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکالی اور رائفل کاندھے پر لٹکا کر ٹارچ جلائی۔ اگر آپ کبھی کسی پہاڑی جنگل میں گئے ہیں تو آپ جانتے ہوں گے کہ وہاں کس غضب کا سنّاٹا ہوتا ہے۔ ہر طرف بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی اور میں ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر ڈالتا اور جھاڑیوں اور درختوں کی لمبی لمبی شاخوں میں راستہ بناتا، آگے بڑھ رہا تھا۔

تقریباً پندرہ مِنٹ بعد مجھے پہلا غار نظر آیا۔ لیکن اُس کا مُنہ بہُت چوڑا تھا اور اُس کے اندر آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اِس لِیے اُس کے اندر راجُو کے چُھپنے کا اِمکان بہُت کم تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اُس کے اندر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ گھُپ اندھیرے میں ٹارچ کی روشنی نے زیادہ کام نہیں کیا۔ میں نے رائفل اُتاری اور اُسے ہاتھ میں پکڑ کر اندر داخل ہوا۔ تھوڑی دُور جاکر غار ختم ہوگیا۔ وہ خالی تھا۔ میں باہر نکلا اور آگے چل پڑا۔ پانچ مِنٹ بعد ایک اور غار نظر آیا۔ یہ پہلے غار کی نِسبت زیادہ بڑا تھا مگر یہ بھی خالی تھا۔

اگلے آدھ گھنٹے میں میں نے تین غار اور دیکھ ڈالے۔ ایک غار میں ایک اِنسانی کھوپڑی اور چند ہڈّیاں نظر آئی تھیں۔ مگر وہ راجُو کی نہیں ہو سکتی تھیں، کیوں کہ وہ بہُت پُرانی تھیں ——— اب میں جنگل کے بیچوں بیچ پہنچ گیا تھا۔ یہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

میں ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک آواز سُنائی دی۔ لیکن وہ فوراً ہی بند ہوگئی۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا کہ یہ کس چیز کی آواز تھی۔ میں نے ٹارچ بُجھائی اور چُپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آواز پھر آئی۔ میں پورے طور پر تو نہیں سمجھ پایا تھا کہ یہ کیسی آواز ہے، لیکن جب کان لگائے تو اندازہ ہوا کہ کوئی چیز گھسیٹی جا رہی ہے۔ میرے ہونٹوں پر مُسکراہٹ دوڑ گئی۔ آخر کار میں نے راجو کا سُراغ لگا لیا تھا۔

میں دبے پاؤں اُس طرف بڑھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ چند قدم چل کر ہی مجھے ایک غار کے آثار نظر آئے۔ اُس کے دہانے کے قریب تین درخت اُگے ہوئے تھے اور اُن کی شاخوں نے غار کا مُنہ چُھپا لیا تھا۔ میں نے آہستہ سے رائفل اُتاری اور غار کے دہانے پر پہنچ گیا۔ اندر سے ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ میں نے رائفل کو سیدھا کیا اور زور سے بولا :

"راجُو! تُم اِس وقت پولیس کے نرغے میں ہو۔ فرار کی کوشش بے کار ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو!"

اندر سے آنے والی آواز ایک دم بند ہوگئی۔ راجو شاید بھونچکا رہ گیا ہوگا۔ اُسے شاید پورا یقین ہوگا کہ یہاں پولیس کا پہنچنا ناممکن ہے۔ مگر اب وہ پھنس چکا تھا۔ میں مُجرموں کی عادت سے واقِف ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک بار مُقابلہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا، اور میں اِس کے لِیے تیّار تھا۔

"راجُو! میں تین تک گِنوں گا۔ اگر تم باہر نہ آئے تو ہم فائر کھول دیں گے" میں نے زور سے کہا۔ میں اُسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ غار کے اِردگِرد پولیس کی کافی نفری موجود ہے، لہٰذا مُقابلہ کرنا بے کار ہے۔

"ایک--- دو---" میں نے گِننا شروع کیا۔

اُسی وقت کسی کے قدموں کی آواز سُنائی دی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ راجُو نے ہتھیار ڈال دیے

ہیں۔ میں مسکرانے لگا۔ رائفل پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ باہر نکل آیا۔ اُسے دیکھ کر میرے بدن میں دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ راجو نہیں، ایک 6 فٹ لمبا ریچھ تھا اور اُس کے مُنہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ شاید وہ غار کے اندر اپنا شکار کھا رہا تھا۔ میں جس جگہ کھڑا تھا، وہاں سے اُس کا فاصلہ مُشکل سے دس فٹ ہوگا۔ چند لمحوں تک ہم ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ یہ میری غلطی تھی۔ ریچھ کی آنکھوں میں قُدرت نے ایک عجیب سی قوّت رکھی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والا سُن سا ہو جاتا ہے اور پھر وہ اُس پر حملہ کر دیتا ہے۔

مجھے یُوں محسوس ہوا کہ میرے جسم میں سے جان نکل رہی ہے۔ اچانک اُس نے ایک چیخ ماری۔ دہشت سے میرے ہاتھ سے رائفل چھُوٹ گئی۔ اُس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اُس وقت مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں نے بائیں جانب کُود کر اپنی جان بچائی۔ میں خوب جانتا تھا کہ اگر میں ریچھ کی گرفت میں آگیا تو پھر میری خیر نہیں۔ اِتنا لمبا اور موٹا ریچھ میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ریچھ نے اپنا وار خالی جاتا دیکھا تو غصّے سے مُڑا۔ میں نے فوراً دوڑ لگا دی۔ وہ بھی میرے پیچھے بھاگا۔ وہ بہت بھاری بھر کم تھا۔ لیکن اُسے پہاڑی جنگل میں بھاگنے کا مجھ سے زیادہ تجربہ تھا۔ اُس کا اور میرا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ اگر میں کچھ دیر اور یوں ہی بھاگتا رہا تو مارا جاؤں گا۔ چُناں چہ میں نے درخت پر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اِردگرد بے شُمار درخت تھے۔ مگر گھبراہٹ کے مارے مجھے کوئی ایسا درخت نظر نہیں آ رہا تھا جس پر میں آسانی سے چڑھ سکتا۔

ریچھ میرے قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے قریب کے ایک درخت کی لٹکی ہوئی شاخ پکڑلی اور تیزی سے اُوپر اُٹھا۔ ریچھ نے اُچک کر میری ٹانگ پکڑنا چاہی تو اُس کے مُنہ میں میرا جُوتا آگیا۔ درد کی ایک شدید لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ میں نے اپنا دوسرا جُوتا اُس کی ناک پر مارا تو اُس نے میرا پاؤں چھوڑ دیا۔ میں جلدی سے درخت پر چڑھ گیا۔ میرے جوتے میں سوراخ ہوگئے تھے اور پاؤں میں سے خون نکل رہا تھا۔

ریچھ چند مِنٹ اُوپر دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی درخت پر چڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر میری جان نکل گئی۔ وہ بھاری بھر کم ہونے کے باوجود بڑی تیزی سے اُوپر چڑھ رہا تھا۔ جوں ہی

وہ میرے قریب پہنچا' میں نے نیچے چھلانگ لگا دی اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ مگر اب میری رفتار بہت ہلکی تھی کیوں کہ میرا دایاں پاؤں زخمی تھا۔

ریچھ اب درخت سے اُتر کر میرے پیچھے بھاگ رہا تھا اور مجھے اپنی موت کا یقین ہوگیا تھا۔ میں نے آخری بار خدا کو یاد کیا اور جُوں ہی وہ میرے قریب پہنچا' میں پھر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ مگر مجھے فوراً پتا چل گیا کہ میں ایک بھیانک غلطی کر بیٹھا ہوں۔ یہ درخت پہاڑی چٹان کے کونے پر تھا اور دوسری جانب کم از کم پانچ سو فُٹ گہری کھائی تھی۔ اب میں دونوں طرف سے پھنس گیا تھا۔ درخت کے نیچے میرے خون کا پیاسا ریچھ تھا اور دوسری جانب گہری کھائی مُنہ کھولے مجھے ہڑپ کرنے کو تیار تھی۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ میں مرنے والا ہوں تو میں نے قرآنِ حکیم کی تِلاوت شروع کر دی۔

ریچھ کچھ دیر اُوپر دیکھتا رہا۔ پھر درخت پر چڑھنے لگا۔ میرے دل سے اب خوف نکل گیا تھا۔ میں اپنی موت کے لِیے تیار تھا اور برابر قُرآنی آیات کی تِلاوت کر رہا تھا۔ ریچھ میرے قریب آیا تو میں ایک اور شاخ پر چڑھ گیا۔ ریچھ بھی اُوپر آگیا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے ہُش ہُش کر کے اُس کو ڈانٹا اور پھر اور اُوپر چڑھ گیا۔ لیکن اُس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اُس کے اور میرے درمیان اب صرف ایک شاخ تھی۔ میں نے اُسے غُصّہ دِلانے کے لِیے مُنہ سے ہُش ہُش کی آوازیں نکالیں۔ نہ جانے اُسے غُصّہ آیا یا نہیں' وہ پھر میری جانب بڑھا۔ اب وہ درمیان والی شاخ پر آگیا تھا۔ اُس نے میرے جانب اپنا ہاتھ بڑھایا تو شاخ اُس کے وزن سے ٹوٹ گئی اور وہ پانچ سو فُٹ گہری کھائی میں جا گرا۔

میں کئی مِنٹ اُس شاخ پر بیٹھا اپنے حواس دُرُست کرتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ نیچے اُترا اور واپس چل پڑا۔ موت کبھی میرے اِتنے قریب سے نہیں گزُری تھی۔ میرا جِسم اب بھی کپ کپا رہا تھا۔ میں لنگڑاتا ہُوا دوبارہ اُس غار کے قریب پہنچا۔ میری رائفل اور ٹارچ وہیں پڑی تھی۔ میں نے ٹارچ اُٹھا کر غار کے اندر روشنی ڈالی تو ایک شخص کی لاش نظر آئی' جسے وہ ریچھ کھا رہا تھا!

اگلے دن پولیس والوں نے مجھے بتایا کہ وہ لاش راجو کی تھی۔ میں اب بھی سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر اُس دن اللہ میری حِفاظت نہ کرتا تو پولیس والوں کو ایک کے بجائے وہاں دو لاشیں مِلتیں!۔

oooooooooooooooo

دُخانی جہاز

سب سے پہلے دُخانی (بھاپ کا) جہاز 1807ء میں رابرٹ فلٹن نامی ایک امریکی نے بنایا۔ اُس کا نام "کلر مونٹ" تھا۔ اُس کے دائیں بائیں پہیئے لگے تھے جو چپّوؤں کی طرح چلتے تھے۔ اُس میں بادبان اور مستُول بھی تھے۔ اُس نے اپنا پہلا سفر' دریائے ہڈسن میں' نیویارک سے البانی تک ساڑھے چار میل فی گھنٹے کی رفتار سے کیا۔

جس دُخانی جہاز نے 1838ء میں سب سے پہلے اوقیانوس کو پار کیا اُس کا نام سیریس تھا۔ اُس میں بادبان اور مستُول نہیں تھے۔ 1840ء میں کنارڈ کمپنی نے چار دُخانی جہاز بنائے جو باقاعدگی سے امریکا جاتے آتے تھے۔

ملّاح دُخانی جہازوں پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ جب اُنہیں یہ بتایا گیا کہ لوہے کا دُخانی جہاز تیار کیا جا رہا ہے تو اُنہوں نے خوب قہقہے مارے۔ لکڑی تیر سکتی ہے، لوہا کیسے تیرے گا مگر لوہے کے جہاز نے تیر کر دکھا دیا۔ 1844ء میں "گریٹ بریٹن" سمندر میں اُتارا گیا اور وہ خوب چلا۔ اِس سے دُخانی جہازوں کا دَور شروع ہوگیا۔

بھیڑیے

کچھ عرصہ پہلے تک لوگوں کا خیال تھا کہ بھیڑیے بہت خوں خوار اور وحشی درندے ہیں۔ وہ جنگلی جانوروں کے دُشمن ہیں اور اِنسان پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چُوکتے۔ لوگوں کے دِلوں میں بھیڑیوں کے خلاف یہ خوف اور نفرت اِتنی شدید تھی کہ اُنھوں نے اندھا دھند اُنہیں ہلاک کرنا شروع کر دیا اور چند ہی برسوں میں ہزاروں بھیڑیے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ بعض عِلاقوں کے زمینداروں نے شکاریوں کے لِیے بھاری اِنعام رکھے تھے۔ جو شکاری کسی بھیڑیے کی لاش لے کر آتا، اُسے اچھّی خاصی رقم دی جاتی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اِس صدی کے شروع تک دُنیا کے اکثر ملکوں میں بھیڑیے بِالکُل ناپید ہو گئے۔

ریاست ہائے مُتّحِدہ امریکا کی حکومت نے یہ دیکھا کہ بھیڑیوں کی نسل ختم ہو رہی ہے تو اُس نے بچے کُھچے بھیڑیوں کی حفاظت کے لِیے قانون بنائے اور بھیڑیوں کے شکار پر پابندی لگا دی۔

اِس کے ساتھ ہی سائنس دانوں نے بھیڑیوں کے بارے میں تحقیق شروع کی اور اُن کی اِس تحقیق کا جو نتیجہ نکلا اُس سے وہ تمام باتیں غلط ثابت ہوگئیں جو بھیڑیوں کے متعلّق مشہور تھیں۔ مثلاً لوگوں کا یہ خیال کہ بھیڑیے اِنسان کے دُشمن ہیں اور اِنسان کو دیکھتے ہی اُس پر حملہ کر دیتے ہیں' بالکل غلط نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھیڑیے اِنسان سے ڈرتے ہیں اور اُس پر حملہ کرنا تو درکنار' اُس کی آہٹ پاتے ہی بھاگ جاتے ہیں۔ سائنس دانوں کو کہیں سے یہ ثبوت نہیں ملا کہ کسی تن دُرست بھیڑیے نے کسی آدمی پر حملہ کیا ہو۔

بھیڑیا کُتّے کے خاندان کا ایک گوشت خور درندہ ہے' اور ایشیا' شمالی امریکا اور یورپ کے شمالی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ درندے عام طور پر بڑے جنگلی جانوروں مثلاً ہرن' نیل گائے' پاڑے وغیرہ کا شکار کرتے ہیں' لیکن اُنہیں بلاوجہ ہلاک نہیں کرتے۔ جب یہ بھوکے ہوں تو جانوروں کے کسی ریوڑ کا پیچھا کرتے ہیں' جانور جان بچانے کے لیے سرپٹ بھاگتے ہیں' اور جو بوڑھا یا بیمار جانور پیچھے رہ جاتا ہے' اُسے مار گراتے ہیں۔ باقی جانوروں کو کچھ نہیں کہتے۔ نوجوان جانوروں اور بچّوں پر بھی حملہ نہیں کرتے۔ عام طور پر صرف بوڑھے اور بیمار جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔

دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگر جنگل میں بڑے جانوروں کی تعداد کم ہو جائے تو بھیڑیے اُس وقت تک انہیں شکار نہیں کرتے جب تک اُن کی تعداد بڑھ نہ جائے۔ اِس دوران میں وہ چھوٹے موٹے جانور مثلاً لومڑیاں' خرگوش' چُوہے اور جنگلی پھل پھول کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ اگر جنگل میں خوراک کی بہت کمی ہو جائے تو بھیڑیوں کی مادائیں ایک سال کے لیے بچّے پیدا کرنا بند کر دیتی ہیں۔

بھیڑیے سوشل یعنی مِل جُل کر رہنے والے جانور ہیں' اور غول بنا کر رہتے ہیں۔ ایک غول میں 5 سے لے کر 20 تک بھیڑیے اور اُن کی مادائیں ہوتی ہیں۔ ہر غول میں دو لیڈر ہوتے ہیں' ایک نر اور ایک اُس کی مادہ۔ سب مِل جُل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر غول کا کوئی ممبر بہت بوڑھا یا بیمار ہو جائے اور شکار کرنے کے قابل نہ رہے تو اُس کے ساتھی اُس کے لیے خوراک لاتے ہیں۔

سب سے زیادہ تعجّب کی بات یہ ہے کہ قُدرت نے بھیڑیوں کو (بعض دوسرے جانوروں کی طرح) آپس میں بات چیت کرنے کی صلاحیّت بخشی ہے۔ وہ کان ہلا کر' بدن کو جھٹکے دے کر' ہلکی اور باریک آوازیں نکال کر' چیخ چلّا کر یا

غُرا کر ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھاتے ہیں۔ جب وہ کسی شکار کو مار گراتے ہیں تو خوشی سے نعرے لگاتے ہیں۔ بچّے کی پیدائش پر بھی مسرّت کا اِظہار کرتے ہیں۔ جب برکھا برس کر آسمان صاف ہو جاتا ہے اور رات کو آسمان پر تارے جگ مگ جگ مگ کرنے لگتے ہیں تو وہ آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر خوشی سے ہو ہو ہو کرتے ہیں۔ غول کا کوئی ممبر کہیں چلا جائے تو چاہے کتنے ہی دن بعد واپس آئے، اُس کے ساتھی اُس کا پُرجوش اِستقبال کرتے ہیں۔

حال ہی میں امریکا کے محکمہ "فِش اینڈ وائلڈ لائف سروِس" نے ایک پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت بھیڑیوں کے غولوں کو امریکا کے اُن جنگلوں میں چھوڑا جائے گا جہاں وہ کسی زمانے میں رہتے تھے اور اب ناپید ہیں۔ چُناں چہ شمالی کیرولینا اور فلوریڈا کے جنگلوں میں بھیڑیوں کے دو غول چھوڑے جا چکے ہیں۔ یہ دونوں غول یہاں آرام سے رہ رہے ہیں اور اُن کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اب دوسری ریاستوں کے جنگلوں میں بھی اِسی طرح کے غول چھوڑے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ لیکن مُصیبت یہ ہے کہ بہُت سے لوگ اب بھی بھیڑیوں سے خوف کھاتے ہیں اور ہر سال بیسیوں بھیڑیے اُن کی بندوقوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ پاکستان ہرے بھرے گھنے اور لمبے چوڑے جنگلوں سے بھرا پڑا تھا، اور اِن جنگلوں میں ہر قسم کے چھوٹے بڑے جانور پائے جاتے تھے۔ لیکن جُوں جُوں آبادی بڑھتی گئی، جنگل کٹتے گئے اور اُن کی جگہ کھیت، گاؤں، قصبے اور شہر آباد ہوگئے۔ جب جنگل نہ رہے تو جنگلی جانور بھی ختم ہوگئے۔ آج سے 60,50 سال پہلے تک بھیڑیے پاکستان کے تقریباً ہر علاقے میں پائے جاتے تھے، لیکن اب صِرف شکرگڑھ، نارووال، سرگودھا، ڈیرہ اسماعیل خان، خاران، چترال اور دریائے سندھ کے آس پاس تھوڑے بہُت ملتے ہیں، لیکن اِن کی زندگی بھی خطرے میں ہے، کیوں کہ لوگ اِنہیں دھڑا دھڑ ہلاک کر رہے ہیں۔

(س-ل)

بادام

بادام گِری دار میوہ ہے۔ اِس کی مُختلِف قِسمیں ہیں۔ ذائقے کے لحاظ سے یہ دو قسم کا ہوتا ہے : میٹھا بادام اور کڑوا بادام۔ میٹھا بادام ہی کھانے کے کام آتا ہے۔ کڑوا بادام زہریلا ہوتا ہے۔ چھلکے کی سختی کے لحاظ سے بھی اِس کی دو قِسمیں ہیں : کاغذی بادام اور کاٹھا' کٹھایا ٹھڑا بادام۔ کاغذی بادام چھوٹا ہوتا ہے لیکن اِس کا چھلکا پتلا اور نرم ہوتا ہے جس کی وجہ سے آسانی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر کاٹھے یا ٹھڑے بادام کا چھلکا سخت اور موٹا ہوتا ہے۔ یہ آسانی سے نہیں ٹوٹتا۔

بادام کی گِری میں روغن' شکر' پروٹین (لحمیات)' معدنی اجزا' نمکیات' نِشاستہ اور وٹامن (حیاتین) پائے جاتے ہیں۔ کڑوے بادام میں اِن چیزوں کے عِلاوہ ایک بہُت تیز قِسم کا زہر "ہائڈرو سیانک ایسڈ" پایا جاتا ہے۔ اِس زہر کی صِرف ایک بُوند اِنسان کو ہلاک کر دینے کے لِیے کافی ہے۔

بادام کا اصل وطن بُحیرۂ رُوم کا ساحِلی عِلاقہ ہے۔ لیکن اب یہ جنوب مغربی ایشیا' اِٹلی' اِسپین' امریکا' پُرتگال' اِیران' افغانستان اور مراکش میں ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام سے ہزاروں سال پہلے مِصر کے بادشاہوں (فرعونوں) کی لاشوں کو محفوظ رکھنے کے لِیے جو مسالے تیّار کِیے جاتے تھے' اُن میں بھی بادام کی گِریاں اِستعمال ہوتی تھیں۔ عراق میں سات ہزار برس پُرانے ایک شہر کی کھُدائی کے دوران میں ماہرین کو اُس زمانے کے بادام ملے ہیں' جن کا چھلکا اور گِریاں بِالکُل محفوظ ہیں اور ذائقے میں بھی فرق نہیں آیا' مگر روغن خشک ہو چکا ہے۔ یہ بادام عراق کے عجائب گھر میں نُمائش کے لِیے رکھے گئے ہیں۔

بادام دماغی صِحّت کے لِیے بہُت مُفید ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مُغل بادشاہ اکبر کی ذہانت کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ باقاعِدگی کے ساتھ بادام اِستعمال کرتا تھا۔ حافظے کی خرابی' نظر کی کم زوری اور عام جِسمانی کم زوری میں بادام کی گِریوں کا اِستعمال بہت فائدہ دیتا ہے۔ اِس کے عِلاوہ بادام کے چھلکے سے بہترین منجن تیّار کیا جاتا ہے جو دانتوں کی بیماریوں کے لِیے بے حد مُفید ہے۔

گائے کے دودھ میں بادام کی گھونٹی ہوئی گِریوں کا دودھ ملا کر اور شہد ڈال کر پیا جائے تو بہُت فائدہ دیتا ہے۔ بادام کے چھلکوں کا تیل پُھلبہری' داد' چنبل اور خشک خارِش کا بہترین علاج ہے۔ دماغی کم زوری' دِل کی کمزوری' خون کی کمی' دُبلے پن' نظر کی کمزوری' یادداشت کی کمزوری' پیاس زیادہ لگنے کی تکلیف' رنگ اندھا پن' مالیخولیا' وہم' قبض' انتڑیوں کی خشکی' معدے کی خرابی' دانتوں کی بیماریوں' نزلہ زکام' آنکھوں کی بیماریوں' کانوں کی بیماریوں' زبان کے زخموں' مُنہ پکنے' کیلسیم کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریوں اور اعصابی تکلیفوں میں بادام کا اِستعمال بہُت فائدہ دیتا ہے۔

بادام کی گِریوں کے پھوک سے اُبٹن تیّار کیا جاتا ہے۔ اِس اُبٹن کو جِسم پر مَل کر نہایا جائے تو جِلد بہُت مُلائم اور چِکنی ہو جاتی ہے اور چہرے کے داغ' چھائیاں اور جُھرّیاں غائب ہو جاتی ہیں۔

بادام کی گِریاں اکثر مٹھائیوں اور کھانوں میں ڈالی جاتی ہیں اور طاقت دینے والی تمام دواؤں میں اِستعمال ہوتی ہیں۔ بچّوں کے لِیے یہ بہُت ہی مُفید ہیں۔ بادام کی گِریوں کو بادام کا شربت' بادام کی سردائی' بادام کا خمیرہ' بادام کا حلوا' بادام کا مُربّا' بادام کا حریرہ' بادام کا جوشاندہ' بادام کی معجون اور بادام کا دودھ بنا کر مختلف طریقوں سے اِستعمال میں لایا جاتا ہے۔ بادام روغن ہزار دواؤں کی ایک دوا اور صِحّت بخش غذا ہے۔

ندی

تعارف اللہ خاوری

نکل کر پہاڑوں سے آتی ہے ندّی
اور شور کافی مچاتی ہے ندّی

ذرا شور اِس کا سُنو غور سے تُم
بڑا پیارا نغمہ سُناتی ہے ندّی

بڑی سخت محنت، مُشقّت سے، دیکھو
پہاڑوں میں رستہ بناتی ہے ندّی

کہیں مُڑ رہی ہے، کہیں گِر رہی ہے
بڑا خوب منظر دِکھاتی ہے ندّی

کہیں پتّھروں سے، شجر سے کہیں پہ
روانی کا زور آزماتی ہے ندّی

چلو سُوئے(1) منزِل، رُکو نہ کہیں پر
سَبق ہم کو یہ بھی سِکھاتی ہے ندّی

(1) منزل کی طرف

بندر اور بندر

ڈاکٹر رضوان ثاقب

بُوٹا محکمہ جنگلات کے پُرانے مُلازمین میں سے تھا۔ وہ تھا تو ایک معمولی ملازِم لیکن اُس کے تجربے کی بِنا پر ہر افسر جنگل کے مُتعلّق معلومات اُسی سے حاصل کرتا تھا۔ دفتر کے لوگوں کا کہنا تھا کہ جو باتیں اُنہیں بُوٹے سے معلوم ہوتی ہیں وہ محکمے کی کتابوں میں بھی نہیں ملتیں۔

بُوٹا خود تو کسی طرح اِس محکمے میں مُلازِم ہوگیا تھا لیکن اُس کے باپ دادا سالہا سال سے بندر کا تماشا دکھا کر روزی کماتے چلے آ رہے تھے۔ بُوٹے کے والِد، کرمُو، کے چار بیٹے تھے، اور اُن کی روزی کا واحِد ذریعہ ایک بندر تھا۔ یہ بندر بلا کا ذہین تھا اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک ہر ایک کی نقل اُتار سکتا تھا۔ کرمُو میلوں اور شادی بیاہ کی تقریبات میں اِسی ہونہار بندر کے ذریعے روزی کماتا تھا۔

وہ ایک رات بندر کا تماشا دکھا کر گھر واپس لوٹا تو آتے ہی بستر پر دراز ہوگیا۔ اُس کے بیٹے سوچنے لگے کہ آج تو اِس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور چائے بھی نہیں پی۔ پھر خود ہی سوچا کہ کسی شادی بیاہ سے خوب سیر ہو کر آیا ہوگا۔

لیکن یہ کیا؟ اگلی صبح کرمُو جو تہجُّد کے وقت بیدار ہو جاتا تھا، آج آٹھ بجے تک بیدار نہیں ہوا۔ اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا فقیر حُسین اُسے جگانے گیا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہ جانے رات کے کس پہر موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ نہ کوئی بیماری، نہ کوئی حادِثہ..... کسی کو بھی یقین نہ آیا کہ وہ مرگیا ہے۔

باپ کی وفات کے بعد اب کرمُو کے بیٹوں کے پاس صرف یہی ایک بندر تھا جو اُن کی روزی کا ذریعہ تھا۔ بُوٹا تو محکمہ جنگلات میں مُلازِم تھا البتّہ باقی تینوں بھائیوں کی گُزر بسر اِسی بندر کے کھیل تماشے پر تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے بوٹے نے سوچا کہ اُس کے تینوں بھائیوں کے پاس اپنا اپنا بندر ہو تو اُن کی آمدنی میں اِضافہ ہو جائے گا۔

اُس کے آفس سے ایک ٹیم جنگل کے مُعائنے کے لِیے جا رہی تھی۔ بُوٹا جانتا تھا کہ یہ جنگل ذہین اور جلد سیکھ جانے والے بندروں کے لِیے بہُت مشہور ہے۔ اُس کے باپ نے بھی یہ بندر اِسی جنگل سے پکڑا تھا۔ باپ جب بندر کا تماشا دکھایا کرتا تھا تو بُوٹا "بچّہ جمُورا" بنا کرتا تھا۔

اُس نے پانچ چھ چھوٹے مُنہ کی کُلھیاں (کُجیاں) اور آدھا کِلو پھلیاں لیں اور اپنی ٹیم کے ساتھ جنگل کو روانہ ہوگیا۔ اُس نے پہلے دن تین کُلھیوں میں پھلیاں ڈال کر اُنہیں ایک درخت کے نیچے رکھا اور اُن کے مُنہ سے بندھی ہوئی رسّی کو دُور ایک کھونٹی سے باندھ کر خود ٹیم کے ساتھ دن بھر جنگل کی سیر کرتا رہا۔ شام کو جب وہ واپس لوٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کُلھیاں بھی خالی ہیں اور

شمس جمیل احمد

بندر بھی کوئی نہیں پھنسا۔ اُسے بندروں کی ذہانت کا عِلم تھا لیکن اِس چال کو تو وہ خاندانی مداری ہونے کے باوجود بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

اگلے دن اُس نے صرف دو کُلھیاں رکھیں اور خود چھُپ کر اُن کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک بندر اپنے دو بچّوں کے ہمراہ وہاں آیا' بچّوں نے برتنوں سے پھلیاں نکالیں اور تینوں مزے سے کھاتے ہوئے چل دیے۔ اب بُوٹا سمجھ گیا کہ بچّوں کے ہاتھ چھوٹے ہوتے ہیں' اِس لیے اُن کی بند مُٹھی برتن میں نہیں پھنستی۔ لیکن اُسے پریشانی اِس بات کی تھی کہ وہ اب بندر کس طرح پکڑے؟ پھر یکایک اُس کے ذہن میں اپنے مرحوم باپ کرمُو کی یہ بات گُونجی کہ بندر اپنی اولاد کو آسان کام دیتے ہیں اور مُشکِل کام اپنے ذِمّے لیتے ہیں۔

باپ کی اِس بات پر غور کرتے ہوئے اُس کے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آئی جس سے وہ بندروں کی اِس چال کو ناکام بنا سکتا تھا۔ اب کی بار اُس نے ایک کُلھیا میں پھلیاں ڈال کر اُسے درخت کے قریب رکھ دیا اور اُس کے اِردگِرد تھوڑے فاصلے پر زمین پر بھی پھلیاں بکھیر دیں۔ اِس دفعہ بھی وہی بندر اپنے دو بچّوں سمیت آیا' زمین پر بکھری ہوئی پھلیاں بچّوں کو کھانے دیں اور خود کُلھیا کی طرف لپکا۔ اُس نے کُلھیا میں ہاتھ ڈالا' پھلیوں کو اپنی مُٹھی میں لیا اور لگا اُس بند مُٹھی کو کُلھیا سے باہر نکالنے۔ اب کُلھیا کا مُنہ اِتنا چوڑا تو تھا نہیں کہ اُس میں سے بندر کی پھلیوں سے بھری ہوئی بند مُٹھی باہر نکل آتی لیکن بندر پھلیوں کے لالچ میں کبھی بھی مُٹھی نہیں کھولتا۔ بندر کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اُس کا یہی لالچ اُسے سدا کے لیے غُلام بنا دے گا تو وہ کبھی ایسا نہ کرے۔ لیکن بندر تو آخر بندر ہوتا ہے۔

اب بُوٹے نے ایک ڈنڈا ہاتھ میں لے کر کُلھیا سے بندھی ہوئی رسّی کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ بندر بھی برتن میں مُٹھی پھنسائے رسّی کے ساتھ ہی چلا آ رہا تھا۔ بندر کے بچّوں نے جب اپنے باپ کو اِس حال میں دیکھا تو چلّانا شروع کر دیا۔ بُوٹا ڈنڈا لے کر اُن کی طرف لپکا تو وہ ڈر کر بھاگ گئے اور بوٹا بندر کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا۔ اگلے دن بھی اُس نے اِسی طریقے کو اپنایا اور دو اور بندر پکڑ لیے۔ جب وہ بندروں کو لے کر اپنے گاؤں میں پہنچا تو بستی کے لوگ اِن سُنہری بالوں والے خوب صورت بندروں کو دیکھنے آئے اور اُنھوں نے بُوٹے کو مُبارک باد دی۔ چاروں بھائیوں کو خوشی کے مارے رات بھر نیند نہ آئی۔ لیکن اُنھیں اب جس چیز کی فکر تھی وہ اُس بوڑھے بندر کی تھی جو اُن کے مرحوم باپ کی نشانی تھا اور جو اِن بندروں کی طرح چُست اور چالاک نہ تھا۔

بوڑھے بندر کو نئے بندروں کا آنا بہُت ناگوار گزُرا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ جب میں اِن کا ہر حُکم مانتا ہوں تو پھر اِنھیں اپنے سال ہا سال کے اِس خادِم کو چھوڑ کر کل کے چھوکروں کو لانے کی کیا ضرورت تھی؟ رفتہ رفتہ تینوں بھائی اپنا سارا وقت نئے آنے والے بندروں کی خاطِر تواضُع میں گزُارنے لگے اور اُس بوڑھے بندر کی طرف اُن کی توجُّہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ نئے بندر تو شہر جا کر خوب مزے لُوٹتے اور وہ بے چارہ سارا دن تنہائی کے دوزخ میں جلتا رہتا۔ وہ جاتے وقت اُسے صحن میں باندھ جاتے اور رات گئے بندروں کا تماشا دکھا کر گھر لوٹتے۔

ایک دن تینوں بھائی اپنے اپنے بندر لے کر شہر گئے۔ بوڑھا بندر صحن میں بندھا ہوا تھا۔ سورج سر پر آگیا تھا۔ پیاس سے اُس کا حلق خُشک ہو رہا تھا۔ وہ گلی سے گزرنے والے ہر راہ گیر کو دیکھتا لیکن کوئی بھی تو ایسا نہ تھا جو اُسے دُھوپ کے اِس جان لیوا عذاب سے نجات دلاتا۔

گُل زار کا لڑکا شاہد شریروں کا پیر تھا۔ وہ ہر وقت اِس تاک میں رہتا کہ کس کا جانور اکیلا بندھا ہُوا ہے تاکہ وہ اُسے ستا سکے۔ لیکن آج اِس بوڑھے بندر کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اُس کو ترس آگیا۔ اُس نے اُس کی رسّی کھول کر

اُس کو اِس عذاب سے نجات دلا دی۔

بندر نے آزادی پاکر اپنے آپ کو پھر سے جوان محسوس کیا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی کھوئی ہوئی طاقت واپس آگئی ہے۔ وہ دوبارہ اُسی جنگل میں جانا چاہتا تھا جہاں وہ پلا بڑھا تھا اور وہاں اُس تجربے کے بَل بوتے پر جو اُس نے اِنسانوں سے سیکھا تھا' حیوانوں کے جنگل کو اِنسانوں کی بستی بنانا چاہتا تھا۔ آخر دو دن مُسلسل چلنے کے بعد وہ جنگل میں پہنچ گیا۔ وہ سیدھا شیر بادشاہ کے پاس پہنچا اور اپنی مُصیبتوں کی داستان سُنا کر جنگل میں ٹھہرنے کی اِجازت مانگی۔ اِس چالاک بندر نے ایک رات میں شیر بادشاہ کی بہت سی کم زوریوں کو بھانپ لیا۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شیر ہر فیصلہ اپنے دوستوں لومڑی اور کُتّے سے مشورے کے بعد کرتا ہے۔

انسانوں کی بستی میں رہ کر وہ اچھّی طرح جان گیا تھا کہ کسی حکومت کو کم زور کرنے کا کیا طریقہ ہوتا ہے۔ چُناں چہ ایک دِن اُس نے ڈبّو کو جا پکڑا۔ پہلے تو اُس کی خوب تعریفیں

کیں، پھر کہا "ڈبّو بھائی، تُم بھی کتنے سیدھے سادے ہو۔ شکار کی اصل چیز تو دل اور دماغ ہوتے ہیں لیکن بادشاہ سلامت جب بھی شکار کرتے ہیں، مکّار اور عیّار لومڑی اِن دونوں مزے دار چیزوں کو کھا جاتی ہے اور آپ کے حِصّے میں چھیچھڑے اور ہڈّیاں آتی ہیں۔ کل ہی لومڑی جنگل کے جانوروں سے کہہ رہی تھی کہ اِس جاہِل کتّے ڈبّو میں تو عقل ہی نہیں جو وہ جان سکے کہ ہر جانور کا ایک دل اور ایک دماغ ہوتا ہے۔ لیکن کتّے کے عِلاوہ بھی اگر کسی نے میری اِس خوراک کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تو یاد رکھو میں اُس کی آنکھیں نکال دوں گی۔ ڈبّو بھائی، بھلا تم ہی بتاؤ کوئی اگر کھاتا بھی رہے اور دھمکاتا بھی رہے اور آپ جناب سرکار کو بے وقوف بھی بناتا رہے تو اُس کا بھلا کیا عِلاج ہونا چاہیے؟" بُوڑھے بندر نے سوالیہ انداز میں ڈبّو کی طرف دیکھا۔

"ہُوں! اگر واقعی تمام جانوروں کے جِسم میں دل اور دماغ ہوتے ہیں تو اِس بات کی تصدیق کے بعد میں اِس لومڑی کی بچّی کا کام تمام کر کے چھوڑوں گا" کُتّے نے للکارتے ہوئے کہا اور اِس بات کی تصدیق کرنے جنگل کی طرف چل دیا۔ اُس نے دو تین جانوروں سے پُوچھا تو اُنھوں نے کہا "ارے بے وقوف! بھلا یہ بھی کوئی پُوچھنے والی بات ہے۔ دل اور دماغ ہی تو ہر جانور کی اصل چیزیں ہیں"۔

جانوروں کی یہ بات سُن کر ڈبّو کا پارہ چڑھ گیا۔ بھاگم بھاگ لومڑی کے پاس گیا۔ لومڑی نے ڈبّو کی غُصیلی آواز سُنی تو گھبرا کر باہر نکلی۔ وہ یہ سوچ کر باہر آئی تھی کہ نہ جانے ڈبّو کس کے ساتھ اُلجھ پڑا ہے۔ اُس کے باہر نکلتے ہی ڈبّو نے اُس کی گردن دبوچ لی۔ اُس کے نوکیلے دانت لومڑی کی گردن کے آرپار ہوگئے۔ اب بے چاری اپنی صفائی میں آواز بھی نہ نکال سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور ڈبّو اُسے چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ بوڑھا بندر اِتنی دیر میں شیر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ جاتے

شرجیل احمد

ہی کہنے لگا "بادشاہ سلامت' اگر اِجازت ہو تو آپ کے چہیتے ڈبّو کی آج کی کارروائی سُناؤں؟ آپ کی سلطنت میں کہ جہاں ہر آنے والے کو اِنصاف ملتا ہے' آج ظُلم کی اِنتہا ہوگئی۔ آج ڈبّو نے آپ کی وفادار دوست لومڑی کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ بادشاہ سلامت' اُس مظلوم کا خون ابھی تک ڈبّو کے مُنہ پر چمک رہا ہے۔ لگتا ہے آپ میں اب وہ جوانی والا دم خم نہیں رہا۔ ورنہ آپ کی سلطنت میں تو کسی چڑیا کو بھی آپ کی اِجازت کے بغیر پر مارنے کی جُرأت نہ ہوتی تھی"۔

بوڑھے بندر کی بات ابھی مُکمّل بھی نہ ہوئی تھی کہ شیر کچھار سے جست لگا کر باہر نکلا اور فراٹے بھرتا لومڑی کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں لومڑی کی لاش پر اُس کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو روتے دیکھا تو غصّے سے پاگل ہوگیا۔

اب اُس کا رُخ ڈبّو کے گھر کی طرف تھا۔ وہاں پہنچ کر جب اُس نے کُتّے کو غرور بھرے انداز میں بیٹھے دیکھا تو شک کی کوئی گُنجائش نہ رہی۔ اِس سے پہلے کہ ڈبّو کچھ کہتا' شیر نے اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا۔

شیر نے ڈبّو کو مار تو ڈالا تھا لیکن اِن دونوں پُر خلوص دوستوں کے بغیر اُس کی زندگی بڑی اُداس گزرنے لگی تھی۔ ایک دن اُسے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جس فرشتہ صِفت بندر نے مجھے ڈبّو کے ظُلم سے آگاہ کیا تھا' کیوں نہ اُس سے مُلاقات کی جائے۔ ہو سکتا ہے اِس سے دل کو کچھ سکون ملے۔ لیکن اُس کو تو اُس کا حُلیہ اور نام بھی یاد نہ تھا۔ اُس نے پورے جنگل میں مُنادی کروا دی کہ جس بندر نے بادشاہ کو ڈبّو کے ظلم سے آگاہ کیا تھا' بادشاہ سلامت اُسے اِنعام و اِکرام سے نوازنا چاہتے ہیں۔

لیکن بوڑھا بندر چھوٹے موٹے اِنعام کو کیا خاطر میں لاتا۔ وہ تو پُورے جنگل پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا وہ شیر کے پاس جانے کی بجائے ڈبّو کے سب سے چھوٹے بیٹے کو ساتھ لے کر جنگل کے تمام جانوروں کے گھر گیا۔ وہ ہر جانور کے پاس جا کر یہ کہتا کہ ظالم بادشاہ نے کسی احمق کے کہنے پر اِس معصوم پلّے کے بے گُناہ باپ کو قتل کر دیا۔ اگر اِس خوں خوار شیر کی حکومت یوں ہی قائم رہی تو ہر سال بے شُمار جانور جان سے ہاتھ دھوتے رہیں گے۔ رفتہ رفتہ جنگل کے تمام جانور بوڑھے بندر کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ بوڑھے بندر کا شیر کے خلاف پروپگنڈا بہت کام یاب جا رہا تھا اور اُس کے حمایتیوں میں اِضافہ ہو رہا تھا۔ اب اُسے ہر جانور کے پاس نہیں جانا پڑتا تھا۔ اکثر جانور اُس کے پاس خود آتے تھے اور وہ اُنہیں شیر کے خلاف بھڑکاتا تھا۔

اُس نے سب سے پہلے موروں کو اُن کی خوب صورت شکل اور سُنہری اور خوش صورت آواز کا اِحساس دلایا اور کہا کہ جنگل کی خوب صورتی تمہارے دم سے ہے تو پھر اِس شیر کو جس میں کوئی بھی خوبی نہیں ہے'

بادشاہ بننے کا کیا حق ہے۔ اِسی طرح اُس نے ہاتھیوں کو اُن کی طاقت کا اِحساس دِلایا اور اُن کو جنگل کا بادشاہ بننے کے لِیے کہا۔ پھر عُقاب کو اُس کی صِفَتیں بتا کر جنگل پر قبضہ کرنے کو کہا۔

غرض سب جانور اپنی زبان، اپنی نسل اور اپنی خوبیوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو شیر سے اعلیٰ سمجھنے لگے اور یوں پُورے جنگل میں تعصّب کی ایک نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اُٹھی۔ ہر جانور حکومت پر قبضہ کر کے باقی تمام جانوروں کو نیست و نابُود کرنا چاہتا تھا۔ جنگل میں ہونے والا ہر اچھا کام اِس لِیے رُک گیا تھا کہ تمام جانوروں نے بھوک ہڑتال کرنے اور مُظاہرے کرنے کا اِعلان کر دیا تھا۔

اِس طرح جنگل کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر جانور قومی فائدے کے بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا تھا۔ بندر کو جب پتا چلتا کہ کوّوں نے کویلوں کے انڈے پی لِیے ہیں، ہاتھیوں نے وہ درخت اُکھاڑ دِیے ہیں جن پر بئے کے گھونسلے تھے، بلّیوں نے چُوہوں کو ہلاک کر دیا ہے اور بڑی مچھلیوں نے چھوٹی مچھلیوں اور مینڈکوں کو کھالیا ہے تو بہُت خوش ہوتا۔

ایک صبح جب جانوروں نے یہ خبر سُنی تو ہکّا بکّا رہ گئے کہ شیر بادشاہ کی کچھار پر نامعلوم دہشت گردوں نے حملہ کر دیا۔ بادشاہ سلامت ہلاک ہو گئے اور اُن کے شہزادے زخمی ہو گئے ہیں۔

جنگل کے اِس مرحوم بادشاہ کے جِگر گوشے زخموں سے تڑپ رہے تھے لیکن اُن کا حال پُوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ البتّہ سب جانور کُرسی کی چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ پورا جنگل جنگ کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ ہرا بھرا سبزہ سُوکھ رہا تھا۔ درختوں کے پتّے زرد ہو ہو کر جھڑ رہے تھے۔ جانوروں کا دن کا سُکُون اور رات کا چین جاتا رہا تھا۔ لیکن کسی کو بھی اُس بوڑھے بندر کے اصل چہرے کو پڑھنے کی توفیق نہ ہوئی۔

کاش! کوئی ایک جانور اِنسانوں کے اِس سدھائے ہوئے بندر کو بے نقاب کر دیتا جو زبان، نسل اور عِلاقائی نفرتوں سے پاک اُس جنگل کو اِنسانوں کی بستی بنانا چاہتا تھا۔

****

بجلی

اِنسان کو یہ بات بہُت پہلے سے معلوم تھی کہ دُنیا میں ایک پُراَسرار طاقت ہے جسے بجلی کہتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ سے چھ سو برس پہلے بھی اِس کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن یہ بات ہم نے پچھلے ڈیڑھ سو برس میں معلوم کی ہے کہ بجلی سے کام کس طرح لینا چاہیئے۔

سب سے پہلی دریافتیں اِٹلی کے ایک سائنس دان وولٹا نے کیں۔ اُس نے 1800ء میں بیٹریاں بنائیں جن میں سے بجلی نکلتی تھی۔ مگر سب سے بڑی دریافتیں ایک انگریز سائنس دان فراڈے نے کیں۔

وہ یورک شائر کے ایک لوہار کا بیٹا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ لندن آگیا تھا۔ یہاں وہ ایک جِلد ساز کے ہاں کام کرنے لگا۔ لیکن اُس کو سائنس سے دل چسپی تھی۔ اِکتیس برس کی عمر میں اُس نے سر ہمفری ڈیوی کے پاس مُلازمت کرلی اور اپنی قابلیّت کا ایسا سکّہ جمایا کہ ڈیوی کی موت پر اُس کی جگہ فراڈے کو رائل اِنسٹی ٹیوشن میں پروفیسر بنایا گیا۔ فراڈے نے بیس برس تک یہ تجربے کِیے کہ بجلی کس طرح بنائی جاتی ہے اور آخر 1831ء میں بجلی کا کرنٹ پیدا کر کے دکھا دیا۔

****

حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ

(1)

ایک بادشاہ نے کسی دانا سے کہا "میں نے بہت دِنوں تک حکومت کی، بہتیرے مُلک فتح کیے، کئی قلعے سر کیے اور بادشاہی کے مزے اُٹھائے۔ اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ زندگی کے دو چار دن باقی ہیں۔ جی میں آتا ہے کہ راج پاٹ چھوڑ کر کسی کونے میں بیٹھ رہوں اور جب تک جان میں جان ہے، اللہ اللہ کروں۔ بھلا تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

دانا نے کہا "میں آپ کو یہ مشورہ نہ دوں گا۔ تسبیح کے دانے گِننے اور وظیفہ پڑھنے کو عِبادت نہیں کہتے۔ اِنسان اللہ کے بندوں سے اچّھا سُلوک کرے اور مُحتاجوں کی مدد کرے تو اللہ اُس سے خوش ہوتا ہے۔

" بادشاہ رِعایا کے ساتھ اِنصاف کرے، ظالموں کو سزا دے اور بے کسوں کی مدد کرتا رہے تو یہی اُس کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے سے زیادہ اچّھا ہے کہ آپ تخت پر بیٹھ کر حکومت کریں۔ اِس طرح آپ سچّی عبادت کر سکیں گے، اور اللہ تو کام دیکھتا ہے، نہ کہ نام"۔

(2)

ایک بادشاہ کے دو بیٹے تھے۔ دونوں ہی پڑھے لکھے اور سمجھ دار تھے۔ بادشاہ نے مرنے سے پہلے اُنہیں اپنے پاس بُلایا اور کہا "میں اپنا مُلک دو حِصّوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ تم دونوں اپنے اپنے عِلاقے پر حکومت کرو۔ میں نے یہ اِنتظام اِس لیے کیا ہے کہ تخت کی خاطر تم آپس میں جنگ نہ کرو"۔

بادشاہ مر گیا تو دونوں بیٹے تخت پر بیٹھے۔ ایک بیٹا لالچی نکلا۔ اُس نے روپیہ جمع کرنے کے لیے رِعایا پر محصول بڑھا دیا۔ ہر روز ایک نیا ٹیکس لگایا اور خزانہ بھرنا شروع کر دیا۔ دوسرا بیٹا سخی اور فراخ دل تھا۔ اُس نے محصول میں رِعایت کی، ٹیکس کم کیے اور رِعایا کے ساتھ مُروّت کی۔

اب پہلے بیٹے کا حال سُنو، اُس کے عِلاقے کے لوگ محصول کی سختی سے پریشان ہو گئے۔ کسان اپنی زمینیں اور تاجر اپنی دُکانیں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ جب لوگ ہی نہ رہے تو آمدنی کہاں سے ہوتی۔ آخر تھوڑے ہی دنوں میں اُس کا خزانہ خالی ہوگیا۔ سپاہیوں کی تنخواہ میں دیر ہونے لگی۔ ملک کا اِنتظام بگڑ گیا۔ دوسرے بادشاہوں نے جب یہ حال دیکھا تو فوجیں لے کر چڑھ دوڑے اور اُس کو قید کر کے ملک پر قبضہ کر لیا۔

دوسرے لڑکے کے اچّھے سُلوک سے رِعایا اُس پر جان چھڑکنے لگی۔ لوگوں نے خوب محنت کی۔ پہلے جہاں بنجر کھیت تھے، وہاں ہرے بھرے کھیت لہلہانے لگے۔ منڈی میں ہر طرح کا مال آتا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا۔ سوداگر خوش حال ہو گئے اور بادشاہ کے خزانے بھر گئے۔ غرض سب کے دن پھر گئے۔ اُس کے ہمسائے میں چھوٹے چھوٹے رئیس آباد تھے۔ ملک کی یہ خوش حالی دیکھ کر اُنہوں نے اُس بادشاہ سے کہا "ہمیں بھی اپنی سلطنَت میں شامل کر لیجیے"۔

اِس طرح اُس بادشاہ کی سلطنَت دُور دُور تک پھیل گئی اور اُس کی عِزّت اور شُہرت میں خوب اِضافہ ہوا۔

ایک سیّاح اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہوٹل میں پہنچا اور مینجر سے بولا "ہمیں تین دن کے لیے ایک کمرا چاہیئے۔ لیکن پہلے یہ بتایئے کہ آپ کھانا کس وقت دیتے ہیں؟"

مینجر نے کہا "صبح ساڑھے سات بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک ناشتا' دوپہر بارہ بجے سے تین بجے تک دوپہر کا کھانا اور شام چھ بجے سے نو بجے تک رات کا کھانا"۔

سیّاح نے اپنی بیوی سے کہا "اِس طرح تو ہمیں سیر کرنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ کہیں اور چلو"۔ (رفیق شاہد' ذی شان آغا' پاک پتن)۔

شاہد (ماں سے) : امّی' میں ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہوں۔

ماں : وہ کیسے؟

شاہد : ناممکن کا "نا" ہٹا کر۔ (خُرم شکیب' منصورہ لاہور)

پہلا دوست : اگر میں وقت ہوتا تو دُنیا میری کتنی قدر کرتی۔

دوسرا دوست : لوگ تُمہیں دیکھ کر دروازہ بند کر لیتے اور کہتے : وہ دیکھو' بُرا وقت آ رہا ہے۔ (محمّد اکرم مونی' لیاقت پور ضلع رحیم یار خان)

ایک آدمی چلتی ہوئی ٹرین میں چڑھنے لگا۔ گارڈ نے اُسے پکڑ لیا اور بولا "آپ کو معلوم نہیں کہ چلتی ہوئی ٹرین میں چڑھنا جُرم ہے؟"

اِتنے میں ٹرین کا آخری ڈبّا آگیا۔ گارڈ بھاگ کر اپنے ڈبّے میں چڑھنے لگا تو اُس آدمی نے اُسے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور بولا "واہ میاں واہ! مجھے تو منع کرتے تھے' اب خود ہی وہ کام کر رہے ہو!" (چودھری جاوید مقصود' مقام کا نام نہیں لکھا)۔

ایک بچّہ حساب کا سوال حل کر رہا تھا' لیکن ہر مرتبہ جواب غلط آتا اور ایک روپے کی کمی رہ جاتی۔ ماسٹر صاحِب غُصّے سے بولے "جب تک صحیح جواب نہیں نکالو گے' چُھٹّی نہیں ملے گی"۔

بچّے نے دو مرتبہ اور کوشش کی لیکن جواب میں بدستُور ایک روپے کی کمی رہی۔ اُس نے تنگ آکر جیب میں سے ایک روپیہ نکالا اور ماسٹر صاحِب کی میز پر رکھ کر بولا "یہ لیجیے ایک روپیہ' اور اب مجھے چُھٹّی دے دیجیے"۔ (عبدُالباسِط' رنگیلا روڈ ہری پور)۔

ایک صاحِب نے بجلی والے سے کہا "میں نے تمہیں اپنے دروازے کی گھنٹی ٹھیک کرنے کو کہا تھا۔ تم کل آئے کیوں نہیں؟"

بجلی والا بولا "سر' میں نے کئی دفعہ آپ کے گھر کی گھنٹی بجائی۔ کوئی باہر نکلا ہی نہیں"۔ (عُمر شریف' ملتان روڈ لاہور)

ایک ڈاکٹر مریض کو دیکھنے گیا تو مریض نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کا اِستقبال کیا۔

ڈاکٹر نے کہا "آج تو آپ بہت بہتر نظر آ رہے ہیں"

"جی ہاں' دراصل میں نے دوا کی شیشی پر لکھی ہوئی ہدایت پر سختی سے عمل کیا ہے" مریض نے جواب دیا۔

"کون سی ہدایت؟" ڈاکٹر نے حیران ہو کر پُوچھا۔

مریض بولا "شیشی کے ڈھکنے کو مضبوطی سے بند رکھیے" (معروف احمد چشتی' حویلی لکھا)

آپ بھی لکھیے

سیدھا راستہ

فہد مجید، ڈیرہ اسماعیل خان

ظفر اور شاکر گہرے دوست تھے۔ دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ میٹرک کے امتحان نزدیک تھے اور اُن کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے نمایاں کامیابی حاصل کریں۔

امتحانوں میں ایک ماہ باقی رہ گیا تھا اور یہ رمضان کا مہینا تھا۔ ظفر روزانہ شاکر کے گھر جاتا اور دونوں مل کر نوٹ تیار کرتے۔ آج پانچواں روزہ تھا۔ دونوں دوست حسبِ معمول پڑھائی میں مصروف تھے کہ شاکر نے ظفر سے کہا "بھئی، تم یہ سوال حل کرو۔ میں ابھی آیا"۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو ظفر نے اُسے غور سے دیکھا اور پھر پوچھا "تم کہاں گئے تھے؟"

شاکر بولا "وہ--- میں ذرا باہر گیا تھا"

ظفر نے کہا "شاکر، تمہیں شرم آنی چاہیئے، اِس مبارک مہینے میں جھوٹ بولتے ہوئے۔ تمہارے منہ پر لگے چاول بتا رہے ہیں کہ آج تم نے روزہ نہیں رکھا"۔

شاکر نے جواب دیا "جب تک میرے پیٹ میں کچھ نہ ہو، مجھ سے پڑھا نہیں جاتا۔ امتحانوں میں صرف ایک ماہ رہ گیا ہے اور میں اچھے نمبروں سے پاس ہونا چاہتا ہوں"۔

"مگر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ طالبِ علم ہونے سے پہلے تم ایک مسلمان ہو۔ دُنیا کے امتحان کی تمہیں اِتنی فکر ہے اور آخرت کے امتحان کی کوئی پروا نہیں۔ روزہ رکھنے سے ہمارا نفس پاک ہوتا ہے اور بھوک پیاس برداشت کرنے سے ہمارے اندر برداشت کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ روزہ دُنیا میں گناہوں کے خلاف اور قیامت کے دن دوزخ کے خلاف ڈھال ہے۔ تم دنیا میں کامیابی چاہتے ہو اور اِسے آخرت پر ترجیح دے رہے ہو، جب کہ آخرت کی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے"۔

شاکر ظفر کی یہ باتیں سُن کر بہت شرمندہ ہُوا۔ اُس نے کہا "تمہاری باتیں مجھے سیدھے راستے پر لے آئی ہیں۔ میں اِن شاء اللہ باقی تمام روزے باقاعدگی سے رکھوں گا، اور جو روزے چھوڑے ہیں ان کا کفّارہ ادا کروں گا"۔ (پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)۔

برف باری کی قیمت

عُمر انوار غوری، شاد باغ لاہور

سُنہری دُھوپ نکلی ہوئی ہے۔ میں اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا اپنے دائیں ٹخنے کی مالش کر رہا ہوں۔ جی، ہاں، یہ برف باری دیکھنے کی قیمت ہے۔

مجھے بچپن ہی سے برف باری دیکھنے کا شوق تھا۔ اِس دفعہ دسمبر کی چھٹیوں میں اخباروں میں مری میں شدید برف باری کی خبریں پڑھ کر یہ شوق انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا۔ تھوڑی سی بحث اور واپس آکر اِسکول کا کام ختم کرنے کا وعدہ کر کے ابّو کو رضامند کر ہی لیا۔ حارث اور عنبر بھی تیار

شہر جبیں گلہ

بچے اور یُوں ہم بُدھ کی شام لاہور سے راول پنڈی روانہ ہوگئے۔ ہم نے سردی سے مقابلے کی بھرپور تیاری کر رکھی تھی۔ ایک رات راول پنڈی میں قیام کے بعد اگلی صبح مری روانہ ہوگئے۔

مری سے تقریباً 20 کلومیٹر اِدھر ہی سردی کی شِدّت میں اچانک اِضافہ ہوگیا اور دُور پہاڑیوں پر برف نظر آنے لگی۔ بانسرہ گلی کے قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ کچھ گاڑیاں برف میں پھنسی ہوئی تھیں، بجلی اور ٹیلی فون کے کھمبے سڑک پر گرے ہوئے تھے اور پولیس کے جوان ایک ایک گاڑی کو اِحتیاط سے گُزار رہے تھے۔

ہم چاروں طرف برف دیکھ کر خوش ہو ہی رہے تھے کہ دوسری طرف سے آنے والی ایک گاڑی کے ڈرائیور نے یہ بُری خبر سُنائی کہ مری کے قریب ٹریفک جام ہوگئی ہے اور گاڑی شہر میں داخل نہیں ہو سکتی۔ یہ سُن کر ہم اُداس ہوگئے اور سوچنے لگے کہ برف باری دیکھنے کی حسرت کہیں دل ہی میں نہ رہ جائے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ویگن چل پڑی۔

کچھ دُور آگے جاکر چند گاڑیاں نظر آئیں۔ اُن میں سے کچھ برف کی وجہ سے پھِسل رہی تھیں اور کچھ گاڑیوں کے لوگ گاڑیوں سے اُتر کر پیدل جا رہے تھے۔

یہاں سے مری شہر صِرف ایک کلومیٹر دور تھا۔ ویگن کا آگے جانا ناممکن تھا کیوں کہ ٹریفک کھُلنے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ ہم نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر ویگن سے اُتر گئے۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہی سرد ہوا نے ہمارا اِستقبال کیا۔ بہرحال، نرم نرم برف پر چلتے، گاڑیوں سے بچتے بچاتے تقریباً ایک گھنٹے بعد مری پہنچ گئے۔

یہاں ہر طرف برف ہی برف تھی اور یہ نظارہ دیکھنے کے قابِل تھا۔ ہم بغیر کسی دُشواری کے ہوٹل میں ایک کمرا حاصِل کرنے میں کام یاب ہوگئے۔ کوئلوں کی انگیٹھی سے کمرا گرم کیا کیوں کہ بجلی تین دن سے غائب تھی اور پانی بھی مشکل سے مِل رہا تھا۔ چائے پینے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد سیر کرنے نکلے۔ شہر میں ہر طرف برف دیکھنے کے شوقین خواتین و حضرات نظر آ رہے تھے۔

پنڈی پوائنٹ تک تمام راستے میں درخت، ہوٹل، گھر، دُکانیں، کھمبے غرض ہر چیز سفید دکھائی دے رہی تھی۔ برف سے لدی درختوں کی ٹہنیوں پر گہرے سیاہ رنگ کے کوّے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ پنڈی پوائنٹ کے قریب برف کے مُجسّمے بنانے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ میں بھی اِس مقابلے میں شامل ہوگیا اور بڑی مشکل سے ایک ایسا بُت بنایا جو اِنسانی شکل سے مِلتا جُلتا تھا۔ میرا یہ مُجسّمہ تیسرے نمبر پر آیا۔

کیبل کار (چیئرلفٹ) کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر بہُت برف پڑی ہوئی تھی اور کئی جگہ جم کر سخت ہوگئی تھی۔ پھر بھی ہم کیبل کار تک پہنچ ہی گئے۔ وہ جِن پہاڑیوں پر سے گُزری وہ سب کی سب برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ابھی ہم کیبل کار سے اُترے بھی نہ تھے کہ پھر برف باری شروع ہوگئی۔ یہ نظارہ بہُت ہی دِل کش تھا۔ سفید برف کے گالے تیزی سے نیچے کی طرف آ رہے تھے اور ہر چیز پر سفیدی کی چادر تان رہے تھے۔ میری جیکٹ، ٹوپی، دستانے، مفلر سب سفید ہوگئے تھے۔ دُور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں، جِن کی چھتوں پر برف جمی ہوئی تھی، بڑا خوب صورت منظر پیش کر رہی تھیں۔

پنڈی پوائنٹ سے واپسی پر سڑک پر مزید برف پڑ چکی تھی۔ لوگ پھِسل پھِسل کر گر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ اِتنے میں میرا پاؤں بھی پھِسلا اور میں چاروں شانے چِت زمین پر گر پڑا۔ میرے ٹخنے پر کافی چوٹ آئی تھی، پھر بھی میں چھڑی کی مدد سے ہوٹل تک پہنچ ہی گیا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ آتے ہی ہم سب بستر میں گھُس گئے۔ آٹھ

بجے رات کو بجلی آگئی، جس سے وقت اچھی طرح گزر گیا، لیکن صبح کو میں نے بستر سے باہر پاؤں رکھا تو چوٹ کا شدّت سے اِحساس ہُوا۔

خیر، ناشتے کے بعد میں بڑی مشکل سے اڈّے تک پہنچا اور ہم لاہور واپس آگئے۔ گھر آکر میں ٹخنے پر دوا کی مالش کرنے لگا تو وہ بڑے میاں یاد آگئے جو برف پر پھسل کر کہہ رہے تھے کہ ہر چیز کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ سو میں نے برف باری دیکھنے کی قیمت ٹخنے پر چوٹ کھانے کی شکل میں ادا کی۔ (دُوسرا اِنعام: 45 روپے کی کتابیں)

اِسے کیا کہیئے؟

خاور خورشید بٹ، گوجرانوالہ

یہ واقعہ ایک سال قبل پیش آیا تھا۔ اُن دِنوں میرے انکل کے ایک غیر مُلکی دوست، ہنری میلکم، سیر و تفریح کی غرض سے پاکستان آئے تھے اور اُن کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ایک دن ہم شہر کی ایک سڑک سے گزر رہے تھے کہ ہنری صاحب نے سڑک کے کنارے ایک زخمی پلّا دیکھا۔ اُنھوں نے گاڑی رُکوائی، پلّے کو اُٹھایا اور ہمیں جانوروں کے ہسپتال کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ مگر افسوس کہ وہ پلّا راستے میں ہی مرگیا۔

اِس واقعے کے چند دن بعد میں اِسکول سے گھر واپس آ رہا تھا کہ میں نے ایک آدمی کو سڑک کے کنارے پڑا دیکھا۔ وہ کسی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا تھا اور گاڑی والا فرار ہوگیا تھا۔ بعض رحم دل راہ گیر گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اُسے ہسپتال پہنچایا جا سکے، مگر کوئی گاڑی نہیں رُک رہی تھی۔

گھر پہنچ کر جب میں آرام کرنے کے لیے لیٹا تو سوچا، کاش! ہمارے ملک کے لوگ بھی مسٹر ہنری کی طرح ہو جائیں جو ایک کُتّے کے پلّے کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اُٹھے تھے، لیکن ہم لوگ ایک قیمتی اِنسانی جان بچانے کے لیے بھی گاڑی نہیں روکتے، حال آں کہ یہ باتیں ہمارے پیارے نبی ﷺ کے اِرشادات میں شامل ہیں، لیکن اِن پر عمل وہ کر رہے ہیں جو مسلمان نہیں ہیں۔ (تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)

جِس نے لیموں پکڑا ہوگا

عبدُاللہ ادیب، پشاور

ہم اپنے کمرے میں بیٹھے + لیٹے = اُونگھتے ہُوئے فزکس کا سبق یاد کر رہے تھے (یا یوں کہیئے کہ رٹّا لگا رہے تھے) کہ اچانک دروازے پر دھپ--- دھپ--- دھپ کی آواز سُنائی دی۔

"یہ کوں بدتمیز ہے؟" ہم نے آواز لگائی۔

"بھائی جان، میں بدتمیز نہیں، اسد ہوں" ہمیں اپنے چھوٹے بھائی کی سُریلی آواز سُنائی دی "میں نے ایک لیموں پکڑا ہے، لیموں"۔

"کیا؟" ہم نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے کہا۔

"جی، جی--- بھائی جان۔ قسم سے میں نے لیموں پکڑا ہے" اسد نے چلّاتے ہوئے کہا۔

"کیا باہر لیموؤں کی بارش ہو رہی ہے؟" ہم نے پُوچھا۔

"نہیں، بھائی جان۔ بارش تو نہیں ہو رہی البتّہ میں نے ایک لیموں بڑی مثل سے پکڑا ہے۔ بھائی جان، یہ سچ مچ کا لیموں نہیں۔ یہ تو پتنگ کی ایک قسم کا نام ہے۔ آپ آکر تو دیکھیں" اسد میاں دروازے پر کھڑے آواز لگا رہے تھے۔

"یہ کس ذاتِ شریف کی پتنگ ہے؟ ذرا ہم بھی تو دیکھیں"۔ یہ کہہ کر ہم نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

شرجیل احمد

"بھائی جان، اِس کو لیموں پتنگ کہتے ہیں" اسد نے ایک پتنگ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اِس پتنگ میں لیموں کی کیا بات ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"بھائی جان، لیموں تو اِس پتنگ کا نام ہے، جیسے دوسرے پتنگوں کے نام ہوتے ہیں مثلاً دو آنکھوں والی پتنگ، چاند تارا پتنگ اور--- اور"۔

"اچّھا، اچّھا۔ مگر میں کیا کروں؟" ہم نے اسد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان، اِس پتنگ کے ساتھ میں نے بہُت سی ڈور بھی پکڑی ہے۔ آپ اِس طرح کریں کہ میرے ساتھ چل کر اِس کو اُڑائیں۔ بڑی تیز ہوا چل رہی ہے، اِیمان سے" اسد نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"اچّھا، چلو" یہ کہہ کر ہم دونوں چھت پر چڑھ گئے۔

اسد میاں نے پتنگ میں ڈور باندھی۔

"اچّھا، اب تم اِسے دُور لے جاکر چھوڑدو" ہم نے کہا۔

اسد نے چند گز دُور جاکر پتنگ کو اُوپر اُچھال دیا اور ہم نے ڈور اپنی طرف کھینچی۔ خوش قسمتی سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ہماری پتنگ ہوا کے دوش پر اُڑنے لگی۔

"بھائی جان، کوّا آگیا--- کوّا" اسد میاں نے چلّاتے ہوئے بتایا۔

"کک--- کہاں ہے کوّا؟" ہم نے گھبرا کر پُوچھا۔

"بھائی جان، اُوپر دیکھیں۔ کوّا پتنگ، ہماری لیموں پتنگ کے ساتھ لڑنے کے لِیے آرہا ہے"۔

ہم نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک کالی سی پتنگ ہماری لیموں پتنگ پر جھپٹ رہی تھی۔ ہم نے اپنی پتنگ کو اُس کالی کلوٹی پتنگ سے بچانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہماری لیموں پتنگ اور کوّا پتنگ آپس میں گتھّم گتھّا ہو چکے تھے۔

"بھائی جان، ڈور چھوڑیں، ڈور---" اسد میاں نے چلّاتے ہوئے کہا۔

اسد میاں کے حُکم پر عمل کرتے ہوئے ہم نے آہستہ آہستہ ڈور چھوڑنی شروع کی لیکن کچھ دیر بعد ہی ہماری پتنگ کٹ گئی۔

"ہائے! میرا لیموں!" اسد میاں نے اپنی پتنگ کو کٹتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"چُپ کرو! ہماری ڈور اچھّی نہیں تھی۔ اِس لِیے پتنگ کٹ گئی" ہم نے اسد میاں کو دِلاسا دیتے ہوئے کہا "مُفت کا مال تھا، سو چلا گیا"

ہم یہ کہہ کر چھت سے نیچے اُترے اور اپنے کمرے میں داخِل ہونے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اسد میاں کی آواز سُنائی دی۔ وہ بڑی غم رنگین آواز میں گا رہے تھے "جانے وہ کون بختاور ہوگا، جس نے لیموں پکڑا ہوگا" (چوتھا اِنعام: 35 روپے کی کتابیں)۔

واہ رے بہادُر!

سمیع ضمیر، ڈیرہ اِسماعیل خان

یہ واقِعہ جو میں آپ کو سُنا رہا ہوں، میرے ایک انکل کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اُن کا نام ظفر ہے اور وہ مُلتان میں رہتے ہیں۔ اچھّی پوسٹ پر فائز ہیں اور ہر ایک پر اپنی بہادُری کا رُعب جماتے ہیں۔ کھانے پینے کے بہُت شوقین ہیں، اِس لِیے ہر کوئی اُن کا ڈیل ڈول دیکھ کر اُنھیں بہادُر سمجھتا تھا۔ لیکن حقیقت اِس سے کچھ مُختلِف تھی۔

ہاں جی، تو ہُوا یُوں کہ ایک رات انکل اپنی امّی کے ساتھ گھر میں اکیلے تھے۔ اور اُن کے ابّو بزنس کے سلسلے میں دوسرے شہر گئے ہوئے تھے کہ رات کے وقت دروازے پر دستک ہُوئی۔ انکل کی والِدہ نے اُن سے کہا کہ دروازے پر

جاکر دیکھو' کون ہے۔ لیکن انکل نے رضائی میں ہی گھسے گھسے جواب دیا "امّی' میری ٹانگ میں سخت درد ہے۔ آپ خود ہی دیکھ لیجیے"۔

چار و ناچار اُن کی والدہ خود اُٹھ کر گئیں اور پُوچھا کہ کون ہے۔ اِس پر دو تین آوازیں آئیں۔ پھر ایک آدمی نے کہا کہ ہم نے آپ کی چھت پر چند آدمیوں کو دیکھا ہے۔ آپ اپنے گھر کے مردوں کو باہر بھیجیں۔ انکل کی امّی اچھّا کہہ کر دروازے کی جِھری میں سے باہر دیکھنے لگیں۔ تینوں آدمی حُلیے سے مشکوک معلوم ہوتے تھے اور آپس میں کھُسر پھُسر کر رہے تھے۔ امّی کو شک ہوا کہ یہ ڈاکو نہ ہوں۔ وہ گھر کے مردوں کو باہر بُلا کر بے ہوش کرنے کے بعد ڈاکا ڈال سکتے تھے۔

امّی نے اندر آکر ساری بات انکل کو بتائی۔ یہ سُنتے ہی اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ لیکن امّی نے تسلّی دی اور کہا کہ برابر والوں کے گھر فون کرو اور اُنہیں ساری بات بتاؤ۔ لیکن اُن پڑوسیوں سے انکل کا جھگڑا تھا کیوں کہ وہ ہمیشہ اُن کی بہادُری کے جُھوٹے قِصّوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ آخر انکل نے مجبور ہو کر اُنہیں فون کر کے مدد کے لِیے کہا۔ وہ بھلے آدمی تھے۔ رَنجش بھلا کر مدد کے لِیے تیاّر ہو گئے اور انکل سے کہا کہ تم ہتھیار لے کر چھت پر جاؤ اور دو تین فائر کرو۔ اِدھر سے میں بھی پستول لے کر اپنی چھت پر جاتا ہوں۔

انکل نے اپنی امّی سے کہا کہ ہمارے پاس تو کوئی اَسلحہ نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا "مجھے یاد آیا' تمہارے ابّو کا ایک پستول الماری میں پڑا ہے' جو اُنہوں نے 1965ء میں خریدا تھا۔ انکل نے جلدی سے الماری کھولی اور اُس میں سے پستول نکالا۔ لیکن اُس کی حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ 1965ء سے لے کر اب تک اپنی حالت پر ماتم کرتا رہا ہے۔

خیر' انکل نے پستول لیا اور ڈگ مگاتے ہوئے قدموں' کانپتے ہوئے ہاتھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سیڑھیاں چڑھے۔ لیکن تین چار سیڑھیاں چڑھ کر نیچے اُتر آئے۔ پھر چڑھے اور پھر اُتر آئے۔ تیسری دفعہ اُن کی امّی نے انہیں دھکّا دیا اور وہ اُوپر جانے پر مجبور ہو گئے۔

چھت پر خوف ناک سنّاٹا تھا۔ اُنہوں نے اپنے خُشک لبوں پر زبان پھیری' ہاتھوں اور ٹانگوں کی لرزِش کو قابُو میں کیا' آنکھوں کو سختی سے بند کیا' پھر ہاتھ بلند کِیے اور اللہ کا نام لے کر پستول کی لَب لَبی دبا دی۔ آواز آئی "پُھس"۔

ارے! یہ کیا؟ پستول تو چلا ہی نہیں۔ دراصل پستول بے کار پڑے پڑے خراب ہو گیا تھا۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ اب کیا کریں کہ اُن کی نظر سامنے پڑی۔ ایک سایہ سا اُن کی چھت پر کُودا تھا۔ اُنہوں نے پستول کو ایک طرف پھینکا' قریب پڑا ہُوا ڈنڈا اُٹھایا اور اُس سائے کے سر پر ٹھاہ کر کے دے مارا۔ سایہ چکرایا اور پھر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ انکل آگے بڑھے اور اُس آدمی کو غور سے دیکھا۔

"ارے! یہ کیا؟ اوفوہ!" انکل کے مُنہ سے نکلا۔ وہ سایہ تو اُن کے پڑوسی کا تھا جو انکل کو چھت پر تنہا دیکھ کر اُن کی مدد کے لِیے آیا تھا۔ انکل بڑی مشکل سے اُسے ہوش میں لائے' مرہم پٹّی کی اور دُودھ گرم کر کے پلایا۔ پڑوسی خوں خوار نظروں سے انکل کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھا تھا کہ انکل نے اُسے زخمی کرنے کے لِیے بہانہ تراشا تھا۔

دوسرے دن جب انکل گھر سے نکلے تو اُنہیں معلوم ہُوا کہ سارے محلّے میں اُن کی بہادُری کے چرچے ہو رہے ہیں۔ ہر کوئی اُن کا مذاق اُڑانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا' اور انکل بے چارے تھے کہ شرم سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ (پانچواں اِنعام: 30 روپے کی کتابیں)۔

****

مُحیط اِسماعیل

گڑیا، سوچ میں گم

ابھی آئی نہیں سکُول سے وہ
آ کے بیٹھے گی کب سُکُون سے وہ
آتے ہی مسکرا کے دیکھے گی
میری موجُودگی پہ خوش ہوگی

بستہ رکھے گی، کپڑے بدلے گی
ہاتھ مُنہ دھو کے کھانا کھائے گی

مجُھ کو الماری سے اُٹھائے گی
بیٹھ کر گود میں بِٹھائے گی

مجُھ سے باتیں کرے گی ہنس ہنس کر
ہاتھ پھیرے گی پیار سے سر پر

مجُھ کو تشبیہ دے گی پھُول سے وہ
ابھی آئی نہیں سکُول سے وہ
آ کے بیٹھے گی کب سُکُون سے وہ

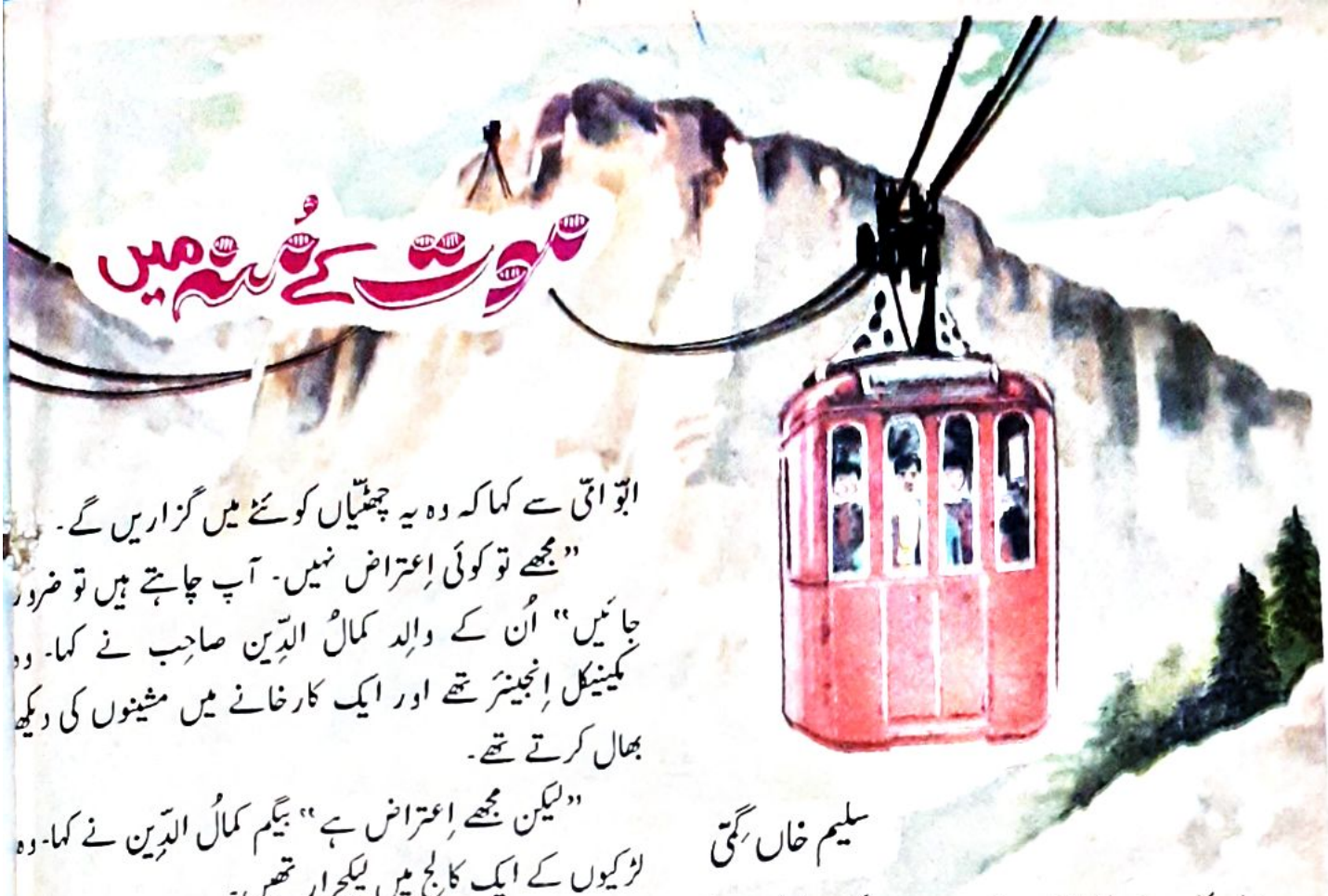

موت کے منہ میں

سلیم خاں گمّی

بہار کا موسم آیا تو ہر طرف پھول کھل اُٹھے۔ میٹھی میٹھی آوازوں والے پرندے میٹھی میٹھی بولیاں بولنے لگے۔ اُن کی چہکاروں اور نغموں نے ہوا میں رس گھول دیا۔ موسم کی تبدیلی سے ہر کوئی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کیا چرند اور کیا پرند، کیا اِنسان اور کیا حیوان، سب ہی موسم کی تبدیلی کے ساتھ اپنے اندر تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بہار کا موسم صائمہ اور عُمر کے لیے بہار کی چھٹیاں لے کر آیا تھا۔

دونوں بہن بھائی اِسلام آباد کے ایک ہائی اِسکول میں پڑھتے تھے۔ صائمہ چھٹی جماعت کی طالبہ تھی اور عُمر ساتویں جماعت کا طالبِ علم۔ اِسکول اِتنا شان دار تھا کہ پڑھائی کے لیے کمپیوٹروں سے مدد لی جاتی تھی۔ جی ہاں، صائمہ اور عمر کے ہائی اِسکول میں طُلبا اور طالبات کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر چلانا بھی سکھایا جاتا تھا۔ غرض کہ یہ اِسکول جو امریکی اِسکولوں کی طرز کا تھا، اساتذہ، طُلبا اور طالبات کو خوب مصروف رکھتا تھا۔

موسمِ بہار کی چھٹیاں ہوئیں تو صائمہ اور عُمر نے اپنے ابّو امّی سے کہا کہ وہ یہ چھٹیاں کوئٹے میں گزاریں گے۔

"مجھے تو کوئی اِعتراض نہیں۔ آپ چاہتے ہیں تو ضرور جائیں" اُن کے والِد کمالُ الدّین صاحِب نے کہا۔ وہ مکینیکل اِنجینئر تھے اور ایک کارخانے میں مشینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

"لیکن مجھے اِعتراض ہے" بیگم کمالُ الدّین نے کہا۔ وہ لڑکیوں کے ایک کالج میں لیکچرار تھیں۔

"امّی، ذرا اِعتراض بیان فرمایئے" صائمہ نے کہا۔

"مجھے آپ لوگوں کے جانے پر اِعتراض نہیں، کوئٹہ جانے پر اِعتراض ہے" بیگم کمالُ الدّین نے کہا۔

"واہ بھئی واہ! یہ کیا بات ہوئی؟ جب آپ کو ہمارے جانے پر اِعتراض نہیں تو ہم کوئٹہ جائیں یا مری، ایبٹ آباد جائیں یا سکردو، مُظفّر آباد جائیں یا نون بگہ۔ اِس سے کیا فرق پڑتا ہے بھلا؟"

"فرق پڑتا ہوگا تب ہی تو آپ کی امّی نے یہ بات کہی" اُن کے ابّو نے اُن کی امّی کا ساتھ دیا۔

"اچھا، یہ بات ہے تو فرق بتایئے، امّی جان؟" صائمہ بولی۔

"فرق یہ پڑتا ہے کہ کوئٹہ، سکردو، نُون بگہ دُور ہیں۔ کوئٹہ بلوچستان میں ہے، سکردو بلتستان میں ہے۔ مظفّر آباد آزاد کشمیر میں ہے اور نُون بگہ تو مظفّر آباد سے بھی پرے شمال کی طرف ہے" صائمہ کی امّی نے وضاحت کی۔

عُمر اب تک چُپ چاپ بیٹھا اِن سب کی باتیں سُن رہا تھا۔ اب اُس کی باری تھی۔ وہ بولا "اِس کا مطلب صائمہ بی

بی' یہ ہُوا کہ ہم ایبٹ آباد یا مری جاسکتے ہیں جو کوئٹہ اور سکردُو وغیرہ کے مقابلے میں قریب ہیں"۔

"میں بھی یہی سمجھی ہوں جو آپ نے سمجھا ہے" صائمہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ اب سوچ رہی تھی کہ مری کی سیر کی جائے یا ایبٹ آباد کی۔

"بتاؤ پھر' کہاں جانا چاہتی ہو؟" عُمر نے بہن سے پُوچھا۔

"میں تو مری جانا چاہوں گی" صائمہ نے کہا۔

"بھلا وہ کیوں؟" عمر نے سوال کیا۔

"وہ اِس لیے کہ مری کے قریب کیبل کار ہے۔ ایبٹ آباد میں کیبل کار نہیں ہے" صائمہ بولی۔

"واہ! کیا خوب سوچا ہے تم نے۔ ایبٹ آباد میں ایسی وادیاں اور پہاڑیاں نہیں ہیں جن کے اُوپر کیبل کار چل سکے۔ ہاں' مری کے علاقے میں ایسی وادیاں ہیں جن کے اُوپر کیبل کار یعنی ٹرالی چلتی ہے" عمر نے خوش ہو کر کہا۔

صائمہ اور عُمر کے ابّو کمالُ الدّین اپنے بچّوں کی بحث دِل چسپی سے سُن رہے تھے۔ مسکرا کر بولے "آپ دونوں بہار کی چھٹیاں پاکستان میں نہیں' اِنگلستان میں گزاریں گے' جہاں آپ کے انکل محبوب خان رہتے ہیں۔ میں آج ہی اُن کو فون کردوں گا۔ لیکن پہلے برٹش ایئرویز جاکر ٹکٹ خرید لوں۔ اِس کے بعد آپ کے انکل کو تاریخ' وقت اور فلائٹ نمبر لکھوا دوں گا"۔

صائمہ اور عُمر کے ابّو کا فیصلہ اِس قدر مزے دار تھا کہ دونوں بچّے اور اُن کی امّی حیرت میں ڈوب گئے اور تینوں نے مل کر اپنی خوشی تالیاں بجا کر ظاہر کی۔

ٹکٹ بھی مل گئے' فلائٹ نمبر بھی مل گیا' تاریخ اور وقت کا بھی پتا چل گیا اور رات کو محبوب خان کو فون بھی ہوگیا۔ وہ لندن کے ایک محلّے ساؤتھ ہال میں رہتے تھے جہاں سے ہیتھرو ایئرپورٹ زیادہ دور نہیں۔ محبوب خان ایک بڑے اِسٹور کے مالک تھے اور اُن کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔

تیسرے دن چھ گھنٹے ہوائی سفر کے بعد عُمر اور صائمہ چچا کے پاس پہنچ گئے۔ اگلے دن دونوں نے ساؤتھ ہال کی سیر کی اور پھر اُس سے اگلے دن ٹرین کے ذریعے ڈھائی سو میل دور آکسفورڈ پہنچے۔ اِس شہر میں پاکستانی' بھارتی اور بنگلہ دیشی باشندے کثرت سے تھے۔ وہاں ہر وہ چیز ملتی تھی جو اُن کو لاہور یا اِسلام آباد میں مُیسّر تھی۔ انگریزی کھانوں کے ساتھ ساتھ دیسی کھانے بھی دستیاب تھے۔ ماحول بھی پاکستان کا سا تھا۔

سب سے پہلے اُنہوں نے آکسفورڈ کا ریڈیو اِسٹیشن دیکھا۔ پھر گھوڑوں پر بیٹھ کر سیر کی۔ اِس کے بعد ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کڑاہی تِکّہ' تِلوں والے نان' دہی' رُوسی سلاد اور ٹھنڈا میٹھا پانی جو دراصل مِنرل واٹر یعنی معدنی پانی تھا۔

"سیر ہوگئی' گھُڑ سواری ہوگئی اور کھانا بھی کھا لیا۔ اب؟ اب کیا پروگرام ہے؟" صائمہ نے عمر سے پوچھا۔

"پروگرام تو تمہارا ہوگا۔ میں تو اُس پر صرف عمل کروں گا" عمر نے کہا۔

"واہ! یہ کیا بات ہوئی؟ سوچنے کا سارا کام آپ نے مجھے دے دیا ہے۔ یہ تو اِنصاف نہ ہوا" صائمہ نے کہا۔

"زمانہ ترقّی کر گیا ہے۔ اب بھائیوں کے بجائے بہنیں زیادہ سوچتی ہیں۔ اِس لیے بہن بن کر سوچو اور پھر مجھے بتاؤ" عمر نے مسکرا کر کہا۔

"اب تو صرف ایک پروگرام باقی ہے۔ اُس پر عمل ہو جائے تو گھر کی راہ لیں" صائمہ نے کہا۔

"جلدی سے بتاؤ۔ کون سا پروگرام ہے؟" عُمر نے پوچھا۔

"کیبل کار یعنی ٹرالی کے ذریعے سیر" صائمہ نے جواب دیا۔

"میں تو بھول ہی گیا تھا۔ چلو' اُٹھو"۔

وہ دونوں اُس اڈّے پر پہنچے جس کا نام گرین وُڈ (ہرا جنگل) ہے اور جہاں سے کیبل کاریں چلتی ہیں۔ اُس کے

ساتھ ہی کنٹرول روم تھا جہاں ایک پاکستانی اِنجینئر اور ایک پاکستانی مکینک اُن کاروں کو جنہیں عام لوگ ٹرالیاں کہتے ہیں' چلاتے تھے۔ وہ ٹکٹ خرید کر کیبل کار میں سوار ہوگئے۔ پہاڑیوں اور وادیوں کے اُوپر یہ آٹھ مِنٹ کی سنسنی خیز سیر تھی۔ یعنی چار مِنٹ جانے کے اور چار منٹ واپس آنے کے۔ کُل فاصِلہ دو میل سے ذرا کم تھا۔ ٹرالی کے اندر سواریوں اور کار کی دیکھ بھال کے لِیئے علی محمّد نامی ایک شخص تھا جو بنگلہ دیش کا رہنے والا تھا۔

صائمہ اور عُمر کے ساتھ ٹرالی میں دوسرے لوگ بھی سوار تھے۔ اِن میں عورتیں بھی تھیں اور بچّے بھی۔ ایک لڑکی زِینت بی بی کے کپڑوں سے پتا چلتا تھا کہ اُس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ اُس کے ساتھ اُس کا خاوِند عبدُاللہ تھا۔ کیبل کار میں بیٹھنے والے سارے پاکستانی تھے جو سیر کے لِیے گرین وُڈ آئے ہوئے تھے۔

"ہم سطح سمندر سے کتنی بلندی پر جائیں گے؟" عمر نے علی محمّد سے پوچھا۔

"مجھے پتا نہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم زمین سے کئی سو فُٹ اُوپر ہیں" علی محمّد نے جواب دیا۔

علی محمّد اَن پڑھ تھا۔ اُسے کیا معلوم کہ ٹرالی سطح سمندر سے کتنے فٹ اُونچی ہوگی۔

"ٹرالی کی فی مِنٹ رفتار کیا ہوگی؟" عمر نے پھر سوال کیا۔

"جی' مجھے اِس کا بھی پتا نہیں۔ اِس کا پتا نیچے کنٹرول روم والے اِنجینئر کو ہوگا" علی محمّد نے جواب دیا۔

"یہ تو سائنس کی باتیں ہیں جو آپ پُوچھ رہے ہیں۔ اِس کو کیا معلوم۔ یہ تو چوکیدار قِسم کا آدمی ہے۔ یہ باتیں آپ واپسی پر خالد ورک سے پوچھیے جو کنٹرول روم میں اِنجینئر ہے"۔ ایک اَدھیڑ عُمر کے شخص نے کہا۔

"ویسے یہ ساری باتیں لکھ کر ٹرالی کے اندر لگا دی جائیں تو بُری بات نہیں" عمر نے کہا۔

"یہ بات بھی واپسی پر آپ کیبل کار کے ٹھیکیدار مسٹر جیکب سے پوچھ لیں" وہی اَدھیڑ عمر کا شخص بولا۔

تین بجے' دوپہر کے بعد' ٹرالی نے اپنا سفر شروع کیا۔ ٹرالی پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا "کار B"۔ گویا ایک کار A بھی تھی۔ وہ شاید کہیں کھڑی ہوئی تھی۔ کار میں علی محمّد سمیت کُل آٹھ لوگ تھے۔ کار یا ٹرالی اب نیچے سے گرین وُڈ کی پہاڑی پر جارہی تھی۔ نیچے گہری وادی تھی۔ سیّاح سفر کے ایک ایک لمحے سے لُطف اُٹھا رہے تھے۔ اُن کے مُنہ سے "کمال ہے! بہت خوب! سُبحان اللہ! واہ بھئی' واہ! اُدھر دیکھو! نیچے دیکھو!" "ویری گُڈ" کے الفاظ نکل رہے تھے۔ سب ہی لوگ یوں محسوس کررہے تھے جیسے کسی جادو نگری میں آگئے ہوں۔

وہ آدھا سفر طے کرچکے تھے کہ دوسری طرف سے ایک اور کار آئی جس پر "کار A" لکھا ہوا تھا۔ وہ اُن کے قریب سے تیزی سے گزر گئی۔ دونوں کاروں کے درمیان چند فُٹ کا فاصِلہ رہا۔ اب "کار B" 45 درجے کے زاویے سے اُوپر جارہی تھی کہ اچانک اُسے جھٹکا لگا۔ وہ کچھ دیر کھڑی ہوئی اور پھر چل پڑی۔

"یہ کیا ہوا؟" صائمہ نے علی محمّد سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" علی محمّد بولا۔

"نہیں۔ کچھ تو ہوا تھا" صائمہ نے کچھ پر زور دے کر کہا۔

"اِس نے کہا کچھ نہیں ہوا تھا' اِس لِیے کچھ نہیں ہوا" عمر نے مسکرا کر کہا۔

"چلو' مان لیا۔ لیکن اگر ٹرالی نیچے وادی میں گر جائے تو کیا ہوگا؟" صائمہ نے سوال کیا۔

"اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو کچھ نہیں بچے گا" عمر بولا۔

علی محمّد نے عُمر کو اِشارہ کیا کہ وہ اُس کے قریب دروازے کے پاس آجائے۔ عمر اُس کے قریب گیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر دُوربین سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ ایک مِنٹ کے بعد ٹرالی آخری سِرے پر پہنچ گئی۔ پھر ذرا دیر کھڑی ہوئی اور پھر پیچھے ہٹنے لگی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا

تھا۔ ذرا پیچھے ہٹ کر ٹرالی آگے بڑھتی تھی اور پھر کھڑی ہو جاتی تھی۔ علی محمدؐ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تاکہ اُترنے کی تیاری کی جائے۔

اچانک وہ کچھ ہُوا جس کی توقّع نہ تھی۔ ٹرالی کو ذرا آگے بڑھنا تھا لیکن وہ آگے نہ بڑھی۔ وہ لوہے کے تاروں پر بہُت تیزی سے نیچے کی طرف دوڑی۔ علی محمدؐ کھُلے دروازے سے یُوں نیچے گِرا جیسے کوئی پتّھر بلندی سے گرتا ہے۔ مسافروں کو کچھ معلوم نہ ہُوا کہ وہ گرا ہے یا اُس نے جان بُوجھ کر چھلانگ لگائی ہے۔ اِس کے بعد عُمر کی باری تھی‘ کیوں کہ دروازہ کھُلا تھا اور وہ دروازے کے پاس کھڑا باہر کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ عمر کے گرنے کے بعد دروازہ شور کے ساتھ بند ہوگیا۔

ٹرالی اب 280 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ رہی تھی کہ اچانک تڑتڑ کی آواز آئی اور ٹرالی کو تاروں سے ہلانے والی گراری ٹوٹ گئی۔ مسافر ٹرالی کے فرش پر گرے اور اِدھر اُدھر لُڑھکنے لگے۔ پھر ٹرالی دھچکے کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اب وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہوا میں لٹک رہی تھی۔ کنٹرول روم میں موجود انجینئر خالد ورک نے "کار B" کو نیچے کی طرف سرپٹ بھاگتے ہوئے دیکھا تو پکارا "بھاگو! دوڑو! ٹرالی نیچے آرہی ہے! اپنی اپنی جان بچاؤ!" اگر ٹرالی نیچے گرتی تو وہ ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں گر کر تباہ ہو جاتی اور سارے مسافر ہلاک ہو جاتے۔

جب ٹرالی بھاگی اور بھاگ کر رُکی تو نیچے دفتر میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہر کوئی حیران پریشان تھا۔ کیبل کاروں کے ٹھیکے دار مسٹر جیکب نے اپنے دفتر میں گھُس کے دروازہ بند کرلیا تاکہ وہ لوگوں کے سوالوں سے بچ سکے۔

صائمہ کا رنگ سفید ہوگیا تھا اور اُس پر سکتہ طاری تھا۔ جب اُسے ذرا ہوش آتا تو وہ پکار اُٹھتی "عُمر بھائی کہاں ہیں؟"

عبدُاللہ اور اُس کی نئی نویلی دُلہن زینت بی بی کی شادی کو صرف چار دن ہوئے تھے۔ اُن کو قے آرہی تھی۔ عبداللہ کوشش کررہا تھا کہ اپنا خوف چھُپالے لیکن کام یاب نہ ہورہا تھا۔ خوف اُس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ ایک مسافر، محمدؐ یُونُس، آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور خوف سے کانپ رہا تھا۔ ایک اور مسافر ریاض عشائی اور اُس کی بیوی مُنوّر سُلطانہ زخمی ہوگئے تھے اور اُن کے زخموں سے خون رِس رہا تھا۔ دوسرے مسافروں کا حال بھی خراب تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب موت سے بچنا ناممکن ہے۔ ٹرالی میں نہ پانی تھا اور نہ دوائیں۔ مسافر وادی کے اُوپر لٹکے ہوئے تھے اور اب موت کا اِنتظار کررہے تھے!

قہر کی وہ رات مسافروں نے جاگ کر اور دُعائیں مانگ کر بسر کی۔ جب آکسفورڈ کی اِنتظامیہ کو اِس حادثے کا

عِلم ہُوا تو اُس نے فوج کی مدد طلب کی اور سات بجے فوجی ہیلی کاپٹر، اِنجینئر اور کمانڈو حادثے کی جگہ پر پہنچ گئے ہیلی کاپٹر کے ذریعے کمانڈو نے مسافروں کو ٹرالی سے اُتارا۔ اِنجینئروں نے رسّوں، پُلیوں اور تاروں کو ٹھیک کیا۔ پھر ٹرالی کو رسّے سے الگ کیا اور اُس کی مَرمّت کی۔

کمانڈو نے نیچے وادی میں علی محمّد اور عُمر کو تلاش کیا۔ علی محمّد پتھّر پر گر کر مرگیا تھا۔ عُمر درخت کی سُوکھی شاخوں کے ایک ڈھیر پر گرا تھا اور بچ گیا تھا۔ بس بے ہوش تھا۔ اُسے ڈاکٹر ہوش میں لے آئے۔

عُمر اور صائمہ کے انکل محبوب خان کا دوست اِعجاز آکسفورڈ میں گوشت کی سپلائی کا کاروبار کرتا تھا اور محبوب خان نے دونوں بچّوں کو اُسی کے پاس بھیجا تھا۔ جب آکسفورڈ کے ریڈیو اِسٹیشن نے مقامی خبروں میں بتایا کہ کیبل کار کا حادِثہ ہوگیا ہے تو اِعجاز کام دھندا چھوڑ کر گرین وُڈ پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ اخباروں اور ریڈیو کے رپورٹر حادثے کی تفصیل لکھ رہے ہیں۔ فوج کے اِنجینئر اور جوان کیبل کار کی مَرمّت کررہے ہیں۔ ہسپتال کا عملہ اور مختلف انجمنوں کے رضاکار زخمی لوگوں کی مرہم پٹّی میں مصروف ہیں۔

اِنگلستان میں پولیس اِسٹیشن کو سروِس اِسٹیشن یعنی خدمت کا مرکز کہا جاتا ہے۔ جب محبوب خان سروِس اِسٹیشن پہنچا تو عُمر اور صائمہ سروِس اِسٹیشن کے مہمان خانے میں ناشتا کررہے تھے۔

"مجھے تو اللہ میاں نے بچالیا" عُمر نے محبوب خان سے کہا۔

"سب کو اللہ تعالیٰ ہی نے بچایا ہے" صائمہ بولی۔

"میں تو کمانڈو بنوں گا" عُمر بولا۔

"اور میں لیڈی ڈاکٹر" صائمہ بولی۔

"اِن شاء اللہ۔ لیکن پاکستان جاکر۔ آپ اِتوار کو پاکستان چلے جائیں گے"۔ محبوب خان نے کہا اور پھر اُنہیں کو لے کر لندن روانہ ہوگیا۔

مجرم کون

مُجرم کون؟

آب شار کالونی کے بنگلا نمبر 0081 میں ڈاکا پڑا۔ ڈاکو بیگم توحید کو گولی مار کے، اُن کی الماری میں سے قیمتی زیورات اور ایک لاکھ روپیہ لے کر چمپت ہوگیا۔ پولیس اِنسپکٹر تفتیش کرنے آیا تو بیگم توحید کے ڈرائیور نے اُسے بتایا :

"سر، میں آج چار بجے سہ پہر بیگم صاحبہ کو لے کر بازار سے واپس آیا۔ بیگم صاحبہ کوٹھی کے اندر چلی گئیں اور میں گیراج میں کار کھڑی کرنے لگا۔ اچانک فائر کی آواز آئی اور ساتھ ہی بیگم صاحبہ کی چیخ سُنائی دی۔ میں گھبرا کر باہر نکلا تو کوٹھی کی مغرب کی طرف والی دیوار پر کسی کا سایہ نظر آیا۔ میں اُس کی طرف دوڑا، لیکن وہ دُور تھا، اِس لیے میں اُسے ٹھیک طرح نہ دیکھ سکا۔ میں کوٹھی کے اندر گیا۔ وہاں لاؤنج کے دروازے پر بیگم صاحبہ پڑی کراہ رہی تھیں۔ میں اُنھیں ہسپتال لے گیا۔ لیکن اُنھوں نے راستے ہی میں دم توڑ دیا تھا"۔

"تم نے کہا کہ یہ واردات سہ پہر کے چار بجے ہُوئی؟" اِنسپکٹر نے پُوچھا۔

"جی، سر" ڈرائیور نے جواب دیا۔

اِنسپکٹر نے سپاہی کو حکم دیا "اِسے ہتھکڑی لگا کر تھانے لے چلو"۔

بتائیے، اِنسپکٹر نے یہ کیسے جانا کہ ڈرائیور ہی مُجرم ہے؟ آپ کا جواب 10 فروری تک ہمیں مل جانا چاہیے۔ صحیح جواب دینے والے ساتھی کو 500 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ جواب کے ساتھ کوپن آنا ضروری ہے۔ کوپن اور جنوری کے "مُجرِم کون" کا صحیح جواب صفحہ 56 پر دیا گیا ہے۔

R. L. No. 4756

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 10.00

Sharjeel Ahmed

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE

FEROZSONS EDUCATIONAL

...PRIMARY SCIENCE is a complete series of twelve s... graded books, well suited to the educational needs of children in English Medium Schools worldwide.
The aim of this series is to present the fundamentals of science in a way which children can easily understand and assimilate. They will not only remember the facts but also remember that the learning of them was a joyful experience.
Each book is divided into a number of parts which cover the main areas of study and are colour-coded for easy reference.
All the books are richly illustrated in colour and each drawing has been specially chosen to complement and support the text.
Each book commences with an interest-stimulating quiz and ends with an extra-curricular exercise entitled 'Do You Know?'

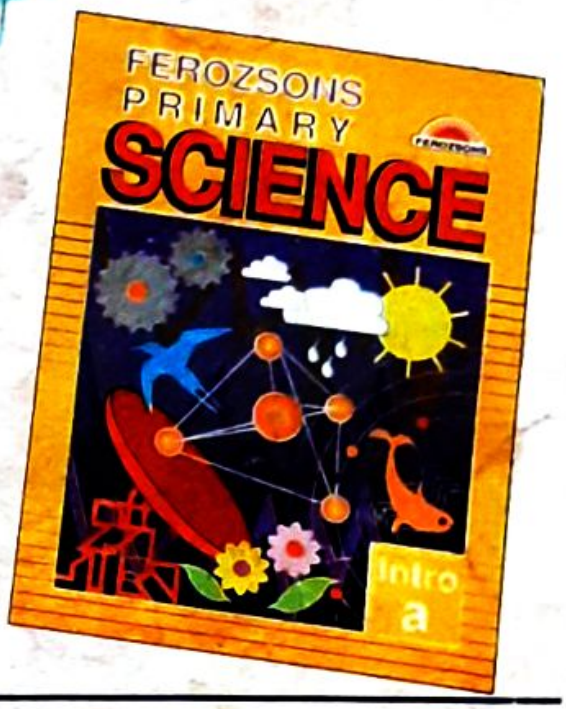

Intro a — 969 0 10141 2 — Rs. 35.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Objects

1a — 969 0 10092 0 — Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Things around us
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Animals and their babies

2a — 969 0 10094 7 — Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Health and safety
Part 3 Animals
Part 4 More about animals
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism

Intro b — 969 0 10142 0 — Rs. 35.00
Part 1 Plants
Part 2 Food
Part 3 Light and Heat
Part 4 Movement
Part 5 Distance
Part 6 Earth and Sky
Part 7 Time

1b — 969 0 10093 9 — Rs. 40.00
Part 1 Objects
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
Part 7 Heat and temperature
Part 8 Light and shadow
Part 9 Time

2b — 969 0 10095 5 — Rs. 40.00
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Electricity
Part 6 Material and matter
Part 7 Time

3a — 969 0 10096 3 — Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound
Part 5 Magnetism
Part 6 More about animals

4a — 969 0 10098 X — Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living things and their needs
Part 4 Living things protect themselves
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism

5a — 969 0 10100 5 — Rs. 50.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound

3b — 969 0 10097 1 — Rs. 40.00
Part 1 Light and colour
Part 2 Plants
Part 3 Heat energy
Part 4 Light energy
Part 5 Force and energy
Part 6 Materials and matter
Part 7 Earth and atmosphere
Part 8 Time

4b — 969 0 10099 8 — Rs. 40.00
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Heat and temperature
Part 4 Electricity
Part 5 Time

5b — 969 0 10101 3 — Rs. 50.00
Part 1 Plants
Part 2 Animals
Part 3 Force and motion
Part 4 Heat and electricity
Part 5 Matter
Part 6 Earth and atmosphere
Part 7 Time

(Prices are subject to change without notice)

Also under publication: Available in 1994

Ferozsons Primary English
Ferozsons Primary Mathematics
Ferozsons Primary Atlas.

FEROZSONS (Pvt) LTD.

LAHORE RAWALPINDI KARACHI

Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Phones: 301196-98 Fax: 6278816
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phone: 563503 Fax: 56427[illegible]
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karachi,
Phones: 570527-570534-537730 Fax: 570534